بابری مسجد
ہندوؤں کی نظر میں

مرتب

محمد ارشد الغزالی ندوی

شائع کردہ
شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی
کلچر ہاؤس ۱۶۹ اندرا نگری علی گنج لکھنؤ



بچوں کی نظمیں

مرتبہ

محمد ارشد الغزالی ندوی

شائع کردہ

شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی

کلچر ہاؤس، 69 اندرا نگری (علی گنج) لکھنؤ ۲۰

طبع اوّل

جولائی ۱۹۹۲ء

نام کتاب ــــ "بابری مسجد ہندوؤں کی نظر میں"

نام مرتب ــــ محمد ارشد الغزالی ندوی

قیمت ــــ ۱۲ روپیہ

ــــ (باہتمام) ــــ

سید معراج الحسن ندوی

ملنے کے پتے

- اسلامی بک ہاؤس امین آباد لکھنؤ
- جنتا میڈیکل اسٹور کھنگا بازار ضلع بہرائچ
- مکتبہ شباب اسلام نزد ندوۃ العلماء لکھنؤ

شائع کردہ: شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی

کلچر ہاؤس 69، اندرا نگری (علی گنج) لکھنؤ ۲۰

فہرست مضامین

عرضِ مرتب

بابری مسجد تنازعہ پر بہت سی تاریخی کتابیں اب تک لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن چوں کہ مسئلہ ابھی تک تازہ ہے اور عوام وخواص میں زیرِ بحث رہتا ہے اس لیے اس پر ہر شخص اپنی رائے پیش کرتا رہتا ہے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں جسارت کی ہے کوشش یہ ہے کہ ایک عام آدمی یہ سمجھ سکے کہ بابری مسجد کا تنازعہ ہے کیا؟ اور کن اسباب کی بنا پر اسے برقرار رکھا جارہا ہے۔

میرے لیے باعثِ مسرت یہ ہے کہ اس کتاب کو شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی لکھنؤ اپنی طرف سے شائع کر رہی ہے۔ امید ہے قارئین اسے پسند کریں گے اور کتاب کی اہمیت وافادیت کو محسوس کریں گے

اس کتاب میں پیش لفظ کے طور پر سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا ایک اداریہ شامل کیا گیا ہے جو معارف میں اپریل ۱۹۸۶ء کو شائع ہوا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پیش لفظ ان تمام رسمی

تحریروں سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوگا جو عموماً کتاب کے مصنفین اور مرتبین اپنی کتابوں پر کسی ممتاز شخصیت سے لکھالیا کرتے ہیں۔

اس کتاب میں صرف ایسے ممتاز غیر مسلم دانشوروں، ادیب اور صحافیوں کے مضامین و تبصرے شامل کئے گئے ہیں جنھوں نے غیر جانبداری سے تاریخی طور پر اس مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے اور اس بات کو تاریخی طور پر ثابت کیا ہے کہ بابری مسجد دراصل صرف ایک مسجد ہے ان کی یہ تحریریں ایک حد تک اس بات کا مکمل سند ہیں کہ بابری مسجد کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی اور نہ ہی اجودھیا حقیقی رام جنم بھومی ہے جس کا دعویٰ چند فرقہ پرست عناصر محض اپنی ہٹ دھرمی سے کر رہے ہیں۔

یقیناً اس کتاب میں بہت سے ایسے غیر مسلم دانشوروں کے مضامین شامل ہونے سے رہ گئے ہیں جن کو شامل کرنا گویا اس کتاب کو تاریخی حیثیت سے ایک دستاویز بنا دینا تھا۔۔۔ لیکن پھر بھی ہم نے بھرپور کوشش کی ہے ۔۔۔

انشاء اللہ اگر موقع ملا اور حالات سازگار رہے تو ان مضامین کو اس کتاب کے دوسرے حصہ کے

کے طور پر شائع کیا جائے گا۔
شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی نے علمی، تحقیقی، سائنسی ادبی اور دینی کتابوں کی اشاعت کا ایک عظیم منصوبہ بنایا ہے اس کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب لوگ ان کتابوں کے پڑھنے بلکہ اسے خریدنے پر تیار ہوں۔
اکیڈمی بچوں کے ادب کی اشاعت میں بھی کافی دلچسپی رکھتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ والدین اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو زبان بطور مادری زبان ضرور پڑھائیں گے۔
دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ ہمیں اردو داں طبقہ خصوصًا دینی ذوق رکھنے والوں سے کتنا تعاون ملتا ہے اور وہ کس شرط پر ملتا ہے ہماری تمام تر کامیابی کا دارومدار ان کی دلچسپی اور تعاون پر ہی منحصر ہے۔

والسلام

محمد ارشد الغزالی ندوی
مورخہ ۳ جولائی ۱۹۹۲ء

افتتاحیہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ بابری مسجد ہندوؤں کے قبضے میں آگئی اور انھوں نے اس کو شہید کر کے مندر بنا دیا تو ان کو محبان وطن کی حیثیت سے بڑے ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا کہ اس کے بعد انھوں نے کیا پایا اور کیا کھویا، کیا اس سے ہندو مذہب کا از سر نو احیاء ہو جائے گا۔؟ کیا ہمارے برادران وطن کے سر تمام دنیا میں اونچے ہو جائیں گے؟ کیا اجودھیا رام چندر جی کی جنم بھومی کی حیثیت سے ایک بار پھر اپنی پرانی عظمت کے ساتھ لوگوں کی نظروں کے سامنے آجائے گا؟

راماین کے بیان کے مطابق اجودھیا چھیانوے ہزار سال سے آباد ہے اس طویل مدت میں اس کو دنیا کی بہترین تیرتھ گاہ بلکہ سیاحوں، زائروں اور تماشائیوں کے لیے جنت نگاہ اور مرکز توجہ ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر یہ شہر جس حال میں ہے، وہ دیکھا

جا سکتا ہے، ہماری حکومت کے بیرونی مہمان اس ملک کے بہت سے قابل دید مقامات کی سیر کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، مگر کوئی بیرونی مہمان ایودھیا دیکھنے کے لیے نہیں بھیجا جاتا، کیا بابری مسجد اس تیرتھ گاہ تک پہونچنے میں رکاوٹ پیدا کرتی رہی، کیا اس کے منہدم ہونے کے بعد اجودھیا کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا جو اب تک نہیں ہو سکا ہے۔

اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس مسجد کے انہدام سے کیا نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کی دل آزاری ہو گی۔ کیا اس سے ہندوستان کی نیک نیتی میں اضافہ ہو گا؟ گذشتہ ۴۰ سال سے قومی یک جہتی جذباتی ہم آہنگی اور سیکولرازم کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، کیا وہ برقرار رہ سکیں گی؟ کیا ہندوستان کے مسلمان یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں گے کہ جب ان کی عبادت گاہیں محفوظ نہیں ہیں تو ان کا وجود کیسے محفوظ رہ سکے گا؟ قومی بہاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کی اکثریت اپنی اقلیتوں کے دلوں کو اپنی رواداری، فراخدلی، وسیع المشربی بلکہ جھک کر تسخیر کرے، نہ کہ ان کو اپنے اقتدار اور حکومت کے زعم میں ان کو آزردہ، دلگیر اور غیر مطمئن رکھے، قومی بہاؤ اور حب الوطنی

گئے بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر چیز میں یکسانیت پیدا کی جائے سکھوں نے تہذیبی اور تمدنی حیثیت سے وہ ساری چیزیں اختیار کر لی تھیں جو آج کل کے قومی بہاؤ کے علم بردار چاہتے ہیں مگر وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے سبق سیکھا جا سکتا ہے۔

اور اگر بابری مسجد کا قضیہ صرف اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے دور حکومت میں صرف مندروں کو منہدم کرتے رہے تو پھر یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کہ ہندوستانی سیاست دانوں کا نہیں بلکہ مورخوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ جائزہ لے کہ ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے اس وقت سے اب تک مسلمانوں نے کتنے مندر منہدم کیے اور ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، دونوں کے اعداد و شمار سے یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون زیادہ قصور وار ہے۔

اب تو صاف اور غیر متعصب ذہن رکھنے والے ہندو مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں جو مندر منہدم کیے گئے وہ تو سرکشی کے مرکز یا معصیت کے اڈے تھے۔ ڈاکٹر ایشور چند ٹوپا نے اپنی کتاب پالی ٹکس ان پری مغل

ٹائمس میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بعض مندر بد اخلاقی کے اڈے تھے ان کے میلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، عورتیں بھی وہاں آتی تھیں اس لیے مندر عبادتگاہ کے بجائے شیطنت کے مرکز بن گئے تھے،

فیروز شاہ تغلق نے اسلامی اور اخلاقی جذبے کے تحت ان مخرب اخلاق اڈوں کو منہدم کرا دیا، یہ ایک الگ سوال ہے کہ فیروز شاہ کو عوام کی بد اخلاقی دور کرنے کا حق تھا یا نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ نے جو کچھ کیا اس میں مذہبی جنون کو دخل نہ تھا، بلکہ عوام کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ایسا کیا، اگر اس میں مندروں کو انہدام کرنے کا جذبہ ہوتا تو ہندوستان کے سارے مندروں کو برباد کرا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ذمیوں کے حقوق کی بنا پر تمام مندر محفوظ رہے۔

(صفحہ ۲۴۷)

رسول اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غیر مسلموں نے آپؐ کی مملکت میں اگر آپ کی حکومت تسلیم کر لی تھی تو ان کو آپ نے یہ حقوق دیے تھے کہ ان کی جانیں ان کا مذہب ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب ان کے

قافلے ان کے سفراء اور ان کی مورتیاں اللہ کی امانت اور اس کے رسولؐ کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی، اور نہ ان کی مورتیاں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت کوئی راہب اپنی رہبانیت، کلیسیا کا کوئی منتظم اپنے عہدے سے نہ ہٹایا جائے گا، جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضے میں ہے اسی طرح رہے گا، اس کے زمانے جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی، ان میں جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔

اسی پر صحابہ کرام کا عمل رہا، اور اگر تعصب کی عینک اتار کر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی روایت سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد سے بہادر شاہ ظفر تک کے عہد تک قائم رہی، اگر اسلام کی ان تعلیمات کی کہیں، وہ کسی زمانے میں کسی سے خلاف ورزی ہوئی، تو اسلامی نقطہ نظر سے اس نے جرم کا ارتکاب ہوا!

ہاں اس کی مثالیں ضرور ملیں گی کہ ہندوستان میں کچھ مندر مسلمانوں کے عہد میں منہدم کیے گئے مگر اس لیے نہیں کہ یہ ہندوؤں کی عبادت گاہیں تھیں بلکہ اس کے اسباب کچھ اور تھے جن کا تجزیہ غیر متعصبانہ انداز سے کرنے کی ضرورت ہے، اورنگ زیب مندر شکنی کا سب سے بڑا مجرم قرار دیا جاتا ہے، برطانوی حکومت کے اشارے سے جدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر جو پانچ جلدیں لکھی ہیں، ان میں اس کی مندر شکنی کی تفصیل پورے زور بیان کے ساتھ لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی شہزادگی اور بادشاہت کے زمانے میں سارس پور، چنتامن، احمد آباد، اورنگ آباد کے گاؤں ستارا، سومناتھ، بنارس کے وشوناتھ، متھرا کے کیشو رائے مندر اور اجین کے مندر کو منہدم کرایا، ان کی گنتی کی جائے تو ان کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہیں ہوتی، ان مندروں کے انہدام کا ذکر جدوناتھ سرکار اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے اورنگ زیب پورے ہندوستان کے مندروں کو منہدم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا، مگر اس نے اپنی راجدھانی آگرہ اور دہلی کے کسی مندر کو منہدم نہیں کیا، اور حیرت تو یہ پڑھ کر ہوتی ہے کہ وہ چھبیس ۲۵ برس تک دکن میں رہا، وہاں اجنتا اور الورہ ہے

جو اس کی آخری آرام گاہ سے میل دو میل پر واقع ہے ان کو اس نے مسمار نہیں کیا، بلکہ اس کا درباری مورخ یعنی مآثر عالمگیری کا مصنف ان کو نظر فریب سیر گاہیں کہہ کر ان کی تعریف کرتا ہے۔

اورنگ زیب نے جن مندروں کو منہدم کیا اس کے اسباب کے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے ڈاکٹر بی۔ این پانڈے کی نظر ہندوستان کے تاریخ پر بڑی گہری ہے اورنگ زیب نے بلا شبہ وارانسی کے وشوناتھ مندر کو منہدم کرایا۔ اس انہدام کی نوعیت کی وضاحت جناب بی۔ این پانڈے نے ۱۲ جولائی ۱۹۷۷ء میں راجیہ سبھا کی ایک تقریر میں اس طرح کی کہ اورنگ زیب بنگال جا رہا تھا تو وارانسی کے پاس سے بھی گزرا اس کے جلو میں ہندو راجے بھی تھے، انھوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ یہاں ایک روز قیام کیا جائے تاکہ ان کی رانیاں وارانسی جا کر گنگا میں اشنان اور وشوناتھ جی کی پوجا کر سکیں فوجی کیمپ سے وارانسی پانچ میل دور تھا، اورنگ زیب کے حکم سے فوج متعین کر دی گئی، رانیاں پالکیوں میں روانہ ہوئیں، انھوں نے گنگا میں اشنان کیا اور وشوناتھ مندر میں پوجا کے لیے گئیں اور رانیاں واپس

آگئیں مگر بیچ کی مہارانی لاپتہ تھی، ہر طرف اس کی تلاش ہوئی، کہیں نہیں ملی، اس گم شدگی پر اورنگ زیب بہت برہم ہوا اس نے مہارانی کی تلاش میں اپنے اونچے عہدیداروں کو مندر کے اندر بھیجا انھوں نے دیکھا کہ اس میں گنیش جی کی مورتی دیوار میں نصب ہے لیکن اس میں حرکت ہوتی رہتی ہے، یہ مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے زینے ایک تہ خانے کے اندر جاتے تھے لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب انھوں نے مہارانی کو اس تہ خانے میں پایا، اس کی عصمت ریزی ہو چکی تھی، اور وہ رو رہی تھی راجاؤں نے اورنگ زیب سے فریاد کی بڑا اہم مسئلہ تھا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ یہ پوتر احاطہ ناپاک کر دیا گیا ہے وشوناتھ کی مورتی تو کہیں اور جگہ منتقل کر دی جائے، لیکن مندر مسمار کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔

ڈاکٹر پتابی سیتارامیہ نے اپنی مشہور کتاب دی فیدرس اینڈ اسٹونس میں اس واقعہ کو پوری سند کے ساتھ لکھا ہے اور ڈاکٹر پی۔ ایل۔ گپتا نے بھی جو پٹنہ میوزیم میں کیوریٹر رہ چکے ہیں اس واقعہ کو دہرایا ہے۔

راجیہ سبھا کی اسی تقریر میں جناب بی۔ این پانڈے نے یہ بھی

کہا کہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرد کے مشورے سے میں نے مختلف اہم مندروں کے مہنتوں کو خطوط لکھے کہ اگر اورنگ زیب نے ان کے مندروں کو کچھ جاگیریں دی ہیں تو اس کے فرامین کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں میرے پاس بھیجی جائیں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب مہاکلیشور، اجین، بالاجی مندر، چترکوٹ، اوما نند گوہاٹی، شترنجے کے جین مندروں اور اسی طرح شمالی ہند کے دو سو مندروں اور گردواروں کی طرف سے مجھ کو ایسے فرامین کی نقلیں ملیں جو سنہ ۱۰۶۹ھ یعنی سنہ ۱۶۵۹ء سے لے کر سنہ ۱۰۹۱ھ یعنی سنہ ۱۶۸۰ء تک جاری رکھے گئے اور اگر تلاش و جستجو کی جائے تو مجھ کو یقین ہے کہ اور بھی بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی، پھر اندازہ ہوگا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اورنگ زیب کا سلوک کیسا کریمانہ رہا۔

خود ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ میں لکھا ہے کہ الہ آباد میں اورنگ زیب کے دو ایسے فرامین ہیں جو مشہور مندر مہیشور ناتھ کے پجاریوں کو اس نے عطا کیے —
گورکھپور کے مہنت چندر (گیان چندر) نے اپنی فراخدلی اور

محنت سے اورنگ زیب کی تقریباً دو درجن ایسی دستاویزیں جمع کی ہیں جو اس نے ہندوستان کے مختلف مندروں اور پجاریوں کے لیے جاری کیں ان پر انھوں نے ایک طویل مضمون بھی لکھا جو ۱۹۵۹ء کے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل میں شائع بھی ہوا۔ مگر ان تمام حقائق کے باوجود انگریزوں نے جو یہ سبق پڑھایا تھا کہ اورنگ زیب کیا بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمان حکمران ہندو کش، ظالم اور ستم گر تھے۔ اسی کی رٹ اب تک لگائی جا رہی ہے۔

بابری مسجد کا قضیہ اسی ہندو کشی، ظلم اور ستم گری کے خلاف انتہا پسند ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے عروج کے زمانے میں گجرات میں ہندوؤں نے جابجا مسجدوں کو توڑ کر ان کی جگہوں پر اپنے گھر بنا لیے تھے۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری۔ جلد دوم صفحہ ۵۷) علی عادل شاہ نے ۹۶۷ھ میں بیجانگر کے راجہ رام راج کو نظام شاہ بحری کے خلاف اپنی مدد کے لیے بلایا تو رام راج نے علی عادل شاہ کے قلمرو کی تمام مسجدیں جلا دیں۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۶) خود جدودھ ناتھ سرکار نے اعتراف کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ست

نامیوں نے نارنول کو لوٹ کر اس کی تمام مسجدیں منہدم کردیں ہسٹری آف اورنگ زیب جلد۲ صفحہ ۳۹۶

اورنگ زیب ہی کے عہد میں کنور بھیم سنگھ نے گجرات میں سو مسجدوں کو جلا دیا (وبرد وینود صفحہ ۱۷۴. اورنگ زیب اظہر الدین فاروقی صفحہ ۱۳۴)

سیوا جی نے افضل خاں کے خلاف مہم میں بھیونڈی اور کلیان کی مسجدوں کو برباد کیا۔ فاروقی صفحہ ۱۳۴)

اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جودھپور کی مسجدیں شہید کر کے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے۔ (منتخب اللباب از خافی خاں جلد دوم صفحہ ۲۴۷)

سکھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں جو ہزاروں مسجدیں برباد کیں اس کی داستان علیحدہ ہے۔ (تاریخ لاہور از کنہیا لال کپور۔ صفحہ ۱۵۱ و ۱۳۵)

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کی جو بے حرمتی اور بربادی کی گئی اس کی داستان المناک ابھی آنکھوں سامنے دیکھی جا سکتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند نے برنی کمیٹی مقرر

کی تھی، اس کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک صرف دہلی کی تقریباً ۱۷۶ مسجدیں ایسی تھیں جن کے تصرف سے مسلمان محروم تھے ان پر یا تو حکومت یا ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اور اب تک وہ واگذاشت نہیں ہوسکی ہیں، دہلی مسلمان بادشاہوں کا بھی دار السلطنت رہا، لیکن کسی مستند حوالے سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہاں ایک سو چہتر مندروں کے تصرف سے ہندو محروم کر دیے گئے تھے، ۱۹۷۹ء میں مغربی بنگال اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ صرف کلکتہ میں ۵۹ مسجدیں ایسی ہیں جن کے قبضے سے مسلمان نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان پر ہندوؤں کا تصرف ہے، اور بعض مسجدوں کو گوبر سے لیپا جاتا ہے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک شہر کے ۵۹ مندروں کی ایسی بے حرمتی کی گئی اور اخباروں میں برابر ذکر آرہا ہے کہ دہلی سے پاکستان کی سرحد تک نو ہزار مسجدیں ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں۔

بابری مسجد کی غلط اور گمراہ کن تاریخ پیش کرکے ہندوؤں کے جذبات مشتعل کیے گئے اور کیے جارہے ہیں موجودہ دور میں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کی عبادت گاہوں کو

ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی ان سے ملک کے ساتھ وفاداری اور قومی بہاؤ کے ساتھ چلنے کا مطالبہ جاری ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ بابری مسجد کا جو قضیہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اسمیں مذہبی تعصب اور انتہا پسند ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی فتح ہوگی یا حکومت ملک کی خیر خواہی اور دوستی میں صحیح اور دانشمندانہ قدم اٹھا کر اپنے تدبر، دور اندیشی اور انجام بینی کا ثبوت دے گی نہ صرف حکومت بلکہ پورے ہندوستان کو سوچنا ہے کہ بابری مسجد کو توڑ کر یہاں کے ۹ نو، کروڑ مسلمانوں کے دلوں کو توڑا جائے گا۔ یا جوڑا جائے گا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دار المصنفین
اعظم گڑھ

ڈاکٹر رمیش پرشاد گرگ

بابری مسجد یا رام جنم بھومی حقیقت کیا ہے؟

ہندوستان ہزاروں سال سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا گہوارہ رہا ہے اور آج بھی مختلف مذاہب اور کلچر کو یہاں پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہے۔ سرزمین ہند کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جو بھی آکر یہاں بس گیا وہ یہیں کا ہو گیا۔ آریہ مسلمان دونوں ہی یہاں کے ماحول میں ڈھل کر یہیں کے ہو گئے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت سے قبل یہاں ہندو مسلم فساد کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اس سے قبل ایک ریاست کی دوسری ریاست سے جنگ برابر ہوا کرتی تھی اور یہ جنگ محض اقتدار کے لیے ہوتی تھی ہندو راجاؤں کی فوج میں مسلمان کثیر تعداد میں فوجی اور سپہ سالار کی شکل میں شامل تھے اور مسلمان بادشاہوں کی فوج میں ہندو سپہ سالار او

سپاہی کثرت سے شامل رہتے تھے اور یہ لوگ اپنے حکمرانوں کا پوری ایمانداری اور وفاداری اور جان و دل سے ساتھ دیتے تھے مغلوں کی سلطنت کو ہندوستان میں مضبوط اور مستحکم بنانے میں راجپوتوں نے جو رول ادا کیا اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اکبر اعظم کی حکومت کو مستحکم بنانے میں راجہ مان سنگھ، راجہ بھگوان داس، راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بیربل اور دیگر ہندوؤں کے تعاون کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اکبر کو اکبر اعظم بنانے والے راجپوت ہی تھے، انھوں نے ہی اسے جہاںگیر بنادیا۔ چتوڑ کے راجہ رانا پرتاپ کو ہلدی گھاٹ کے میدان میں مان سنگھ نے ہی شکست دی تھی۔ اور اسی نے چتوڑ کو مغل سلطنت کا ایک لازمی حصہ بنادیا۔

جہانگیر تو اکبر کی ہندو رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر اس نے بھی راجپوت راجاؤں کی بیٹیوں سے شادی کی، شاہ جہاں کا دور تو ہندوستان کا عہد زریں مانا جاتا ہے اور اورنگ زیب بھی اپنے پیش رو حکمرانوں سے ہندو نوازی میں کوئی پیچھے نہ تھا، اس کے سپہ سالار راجہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ تھے، اس نے بھی ایک ہندو رانی اُدے بائی سے شادی کی تھی۔

اور اپنے لڑکے بہادر شاہ کی شادی رابعہ جے سنگھ کی بیٹی سے کی تھی، اس طرح بابر سے لیکر اورنگ زیب تک اس کے بعد بھی بہادر شاہ ظفر تک جتنے بھی مُغل بادشاہ ہوئے سبھی مذہبی تعصب سے پاک تھے، اس طرح شیواجی کی فوج میں بھی مسلمان سپاہی اور افسر موجود تھے، جب احمد شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو پیشوا باجی راؤ کی طرف سے مسلمانوں نے بھی احمد شاہ کا مقابلہ کیا اور جان عزیز قربان کی۔

انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کو پائدار بنانے اور ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی غرض سے تعصب میں ڈوبی ہوئی کچھ ایسی تاریخی کتابیں لکھوا کر اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کر دیں جن کو پڑھ کر ہندوؤں کے دلوں میں پُرانے مسلم حکمرانوں سے نفرت پیدا ہو جائے اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ سبھی نہیں تو بیشتر مسلم حکمراں ہندوؤں کے کٹّر دشمن تھے۔ انھوں نے ان کے سبھی مشہور مندروں کو توڑ کر ان پر عالی شان مسجدیں تعمیر کرادیں، تلوار کے زور سے لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنا ڈالا۔ ان کی بہو بیٹیوں کو بے عزّت کیا، اور اپنے گھر کی زینت بنا لیا جبکہ یہ ساری باتیں صریحی جھوٹ میں

قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک کبھی مسلم بادشاہوں نے اس ملک کو اپنا وطن سمجھا۔ یہ لوگ اس ملک کی دولت نہ تو یہاں سے باہر لے گئے اور نہ ہی اس ملک سے باہر انھوں نے کوئی عمارت بنوائی، قطب مینار، تاج محل، لال قلعہ، جامع مسجد، موتی مسجد، بلند دروازہ، مکہ مسجد، آگرہ کا قلعہ وغیرہ ایسی عمارتیں ہیں جن پر ساری دنیا کو ناز ہے اور یہ عمارتیں آج بھی دنیا میں ہندوستان کے سر کو بلند کئے ہوئے ہیں۔

رام جنم بھومی کو توڑ کر بابری مسجد بنانے، کاشی وشوناتھ مندر توڑ کر گیان باپی مسجد بنانے، متھرا کے کرشن جنم بھومی مندر توڑ کر عیدگاہ بنانے، جونپور کی اٹالہ دیوی، مندر کو توڑ کر اٹالہ مسجد بنانے، بندو مادھو کے مندر کو توڑ کر دھرہرہ کی مسجد تعمیر کرانے کی بات محض من گھڑت کہانی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اس کا مقصد ملک کے امن و امان کو خطرہ میں ڈالنا اور ہندو مسلم فساد کرا کے قومی اتحاد کا شیرازہ بکھیرنا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان فرقہ پرست تنظیموں کو بیرونی ملکوں سے امداد بھی مل رہی ہو جو مسجدوں کو مندر ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

جہاں تک مسلم حکمرانوں کا سوال ہے ان کی رواداری اور ہندو

دوستی کا اعتراف سبھی انصاف پسند مورخوں نے کیا ہے۔ بابر، ہمایوں شیر شاہ سوری اور اکبر و جہانگیر کی رواداری، انصاف، رعایا پروری کی تعریف سبھی نے کی ہے۔ سر جدو ناتھ سرکار ڈاکٹر تارا چند اور ایشوری پرشاد کی تاریخی کتابیں اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ ان بادشاہوں نے ہندوستان میں کسی مندر کو نہیں توڑوایا اور نہ ہی مذہبی تعصب سے کام لیا۔

ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی تصنیف "انڈیا ڈیوائیڈڈ" میں لکھا ہے کہ بابر نے اپنے بیٹے نصیر الدین محمد ہمایوں کو حکومت کے معاملے میں تعصب سے کام نہ لینے کی ہدایت کی تھی، اور ہندو رعایا کی دلجوئی کے لیے گئو کشی پر پابندی لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ وصیت نامہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو رعایا حکومت کی مطیع و فرمانبردار ہوتی ہے اس کے عبادت خانوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے اور اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔

اس واضح ثبوت کے باوجود یہ مان لینا کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر اس پر بابری مسجد تعمیر کروائی صرف جھوٹ ہے اور سچائی کو جھٹلانا ہے، شری رام چندر جی ہندوؤں کے معزز دیوتا

ہیں۔ بابر اسلام مذہب کا کٹر پابند تھا۔
بانی اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کو کسی بھی فرقے کے معزز افراد کی تعظیم کرنی چاہیے۔ ایسی صورت میں بابر کس طرح اپنے مذہبی رہنماؤں کی تعلیم سے انحراف کر سکتا تھا قرآن نے تو کسی کے جھوٹے خدا کو برا کہنے سے بھی منع کیا ہے کیوں کہ وہ شخص ناراض ہو کر ہمارے سچے خدا کو کہیں برا نہ کہہ دے۔
اگر بابر شری رام جنم بھومی کو توڑواتا تو اس پر مسجد ہرگز تعمیر نہ کرواتا، کیوں کہ مسجد پاک وصاف زمین پر تعمیر ہوتی ہے کسی کے عبادت خانے کو توڑ کر کسی کی زمین غصب کر کے اس پر مسجد تعمیر نہیں کی جا سکتی ہے اور ایسی تعمیر شدہ مسجد میں نماز پڑھنے پر نمازی ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ گناہ مسجد تعمیر کرنے والے کے نام لکھا جاتا ہے
شریعت کی اس واضح ہدایت کو جانتے ہوئے بابر کیوں گناہ مول لیتا۔ اگر اسے عمارت ہی بنوانا ہوتا تو وہ اس پر اپنا محل، قلعہ یا دیگر یادگار بناتا تاریخ کی کسی بھی کتاب سے رام جنم بھومی کے مندر کو توڑنے کی بات ثابت نہیں ہوتی یہ صرف

فرقہ پرست عناصر کی سازش ہے جس کا مقصد صرف ہندستان کو مذہبی جنگ کی آگ میں جھونکنا اور یہاں ہندو راج قائم کرنا ہے جو لوگ مسجدوں کو مندر بنانے کی بات کر رہے ہیں وہ ہندستان کے تعلقات مسلم ملکوں کے ساتھ خراب کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک تاریخی اور دستاویزی ثبوت کا سوال ہے بھگوان شری رام، بھگوان شری کرشن اور بھگوان شنکر کسی کا سال پیدائش تاریخی کتابوں سے ثابت نہیں ہوتا' یہ سبھی مہاپرش پورانک ہیں اور بکرمی سمبت سے سینکڑوں سال قبل پیدا ہوئے بالمیکی رامائن، مہابھارت، وشنو پران' شرید بھگوت گیتا ہنومان چالیسا، گوسوامی تلسی داس کی رام چرت مانس جیسی مقدس کتابیں بھی ان مذہبی رہنماؤں کا سال پیدائش بتانے سے قاصر ہیں۔ تلسی داس بھی رام چندر جی کے بہت بڑے بھگت تھے انھوں نے شری رام کی مدح سرائی میں سیکڑوں اشعار لکھے لیکن انھوں نے رام جنم بھومی کے توڑے جانے کا کوئی ذکر اپنی کسی کتاب میں نہیں کیا۔ جبکہ بابر کا انتقال ۱۵۳۰ء میں ہوا تھا اور اکبر ۱۵۵۶ء میں بادشاہ ہوا تھا۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ گوسوامی تلسی داس جی نے اکبر کے خوف

کی وجہ سے اس کے دادا بابر کے ظلم کے خلاف زبان نہ کھولی اور کوئی بھی ہندو مصنف بابر کے ظلم کے خلاف بہادر شاہ کے عہد حکومت تک مغلوں کے خوف کی وجہ سے نہ بولا تو انگریزوں کے دور حکومت میں تو اس کا تصفیہ کرا ہی جا سکتا تھا کہ انگریز خود ہی مسلمانوں کے خلاف تھے انھیں تو اس کے ذریعہ ہندوستان کے اکثریتی فرقے کو اپنا ہمنوا بنانے اور مسلمانوں کو ڈرانے دھمکانے کا ایک اور موقع ہاتھ آ جاتا، کیوں کہ ان کا مقصد تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنا تھا اگر ان کے سامنے رام جنم بھومی مندر کا ثبوت پیش کیا جاتا تو وہ ہندوؤں کو واپس دینے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے۔

انگریزوں کے دور حکومت میں ہندو قوم میں بہت سے دانشور، مفکر، مورخ، سیاسی اور مذہبی رہنما ہوئے مثلاً دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، سوامی رام کرشن پرم ہنس، راجہ رام موہن رائے، لوک مانیہ تلک لالہ لاجپت رائے، وپن چندرپال، دیش بندھو چترنجن داس، پنڈت موتی لعل نہرو، مہاتما گاندھی، شیو پرشاد گپتا، راجہ جی، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، منشی پریم چند، ڈاکٹر سمپورنا نند، سردار پٹیل،

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، مرارجی ڈیسائی، چودھری چرن سنگھ وغیرہ لیکن کسی نے بھی اپنی تحریر اور تقریر سے بابری مسجد کے رام جنم بھومی مندر ہونے کی شہادت نہیں دی جبکہ بابری مسجد کا وجود تاریخ سے ثابت ہے۔

شہنشاہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی کو شکست دیکر دلی پر اپنا قبضہ جمالیا، اس طرح اس نے ہندستان میں مغل سلطنت کی بُنیاد رکھی اس کے بعد اس نے خانوہ کی جنگ میں راجہ سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا کو ہرا کر اپنی حکومت مضبوط کی۔

بابر کا اجودھیا آنا کسی بھی تاریخی کتاب سے ثابت نہیں ہے انگریز مورخ اے، ایس بیورج جس نے تزک بابری کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اپنی کتاب میموئیرس آف بابر مطبوعہ لندن ۱۹۲۲ء ص ۶۷۹-۸۷ میں بابر کے ذریعہ اپنے حکام میں سے ایک شیخ بایزید کی بغاوت کو دبائے جانے کا واضح طور پر ذکر کیا ہے اس نے لکھا ہے کہ بابر نے پورب کی طرف سے گھاگھرا کو پار کرنے کا کام اجودھیا سے میلوں دور کیا۔ بابر نے بایزید کی بغاوت دبانے کے بعد اس کی جگہ پر میر باقی کو اودھ کا صوبہ دار قرار دیا۔

میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں ایک پرتی زمین پر مسجد تعمیر کرائی جو

بعد میں بابری مسجد کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوئی، بابری مسجد پر جو کتبہ لگا ہوا ہے وہ بابر کے عدل وانصاف کا آئینہ دار ہے۔ کتبہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش
بنائیست باکاخ گردوں ملاقی

شاہ بابر کے فرمان کے مطابق کہ جن کے عدل وانصاف نے ایک ایسی عمارت تیار کی جو آسمان کے محل تک ملتی ہے اس شعر میں لفظ عدلش انتہائی قابل توجہ ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسجد کی بنیاد عدل وانصاف پر ہوئی ہے نہ کہ ظلم پر ظاہر ہے کہ مندروں کو توڑ کر ان کی جگہ مسجد تعمیر کرنا عدل و انصاف کے منافی ہے اور بابر جیسے انصاف پسند بادشاہ سے ایسی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ پھر دوسرا شعر ہے۔

بنا کرد ایں مہبط قدسیاں را
امیر سعادت نشاں میر باقی

امیر سعادت نشاں میر باقی (جو شہنشاہ بابر کے کارندے تھے) نے فرشتوں کے نازل ہونے کا یہ مقام تعمیر کیا۔

بود خیر باقی چوں سال بنائش   عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی

مسجد کا یہ کارخیر باقی رہے اور میر باقی کا یہ کار خیر مضبوط اور مستحکم رہے، بود خیر باقی سے مادہ تاریخ ۹۳۵ھ نکلتا ہے

بابر بادشاہ نے مسجد کے انتظام و انصرام کے لیے ساٹھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ پورے مغل دور حکومت تک یہی رقم مسجد کی دیکھ بھال کے لیے ملتی رہی، اودھ کے نواب نے اسمیں اضافہ کر کے اسے ۳۰۲ روپیہ ۱۳ آنہ چھ پائی کر دیا۔ برٹش دور حکومت تک یہی رقم مسجد کی دیکھ بھال کے لیے ملتی رہی بندوبست اول کے وقت مسجد کی دیکھ بھال کے لیے دو گاؤں بھولا پوری اور بہارن پور معافی دے دیئے گئے اس کی آمدنی سے مسجد کی دیکھ بھال ہوتی رہی۔

لارڈ ڈفرن (۱۸۸۴۔۱۸۸۸ء) کے زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر برٹش حکومت کو مضبوط بنانے کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کے تحت ایک بدھشٹ نجومی سے ایک زائچہ بنوایا گیا۔ جس نے بابری مسجد کے اندر رام جنم ظہومی استھان ہونے اور سیتا جی کا رسوئی گھر ہونے کی بات کہی۔ اسے بنیاد بنا کر رگھوبر داس مہنت نے سب جج فیض آباد کے اجلاس میں ۱۸۸۵ء میں ایک دعویٰ دائر کیا۔ رگھوبر داس

نے اپنے کو رام جنم بھومی استھان کا مہنت قرار دیا تھا اور مسجد کے سامنے کے چبوترے پر عمارت تعمیر کرنے کی اجازت مانگی تھی مہنت نے اپنے دعویٰ میں بابری مسجد کے وجود کو تسلیم کیا تھا اور چبوترے کے پچھم میں بابری مسجد کا ہونا نقشہ فطری میں ظاہر کیا تھا۔

۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کی عدالت نے دعویٰ خارج کر دیا۔ مہنت نے اس کے خلاف اپیل کی کہ وہ اپیل بھی خارج ہو گئی۔

جب برطانوی حکومت نے مسلم وقف بورڈ قائم کیا تو وقف کمشنر نے صوبہ کی تمام مسجدوں کا سروے کرایا۔ اسی وقت وقف بورڈ میں بابری مسجد کا رجسٹریشن وقف رجسٹر میں درج کیا گیا۔

جب سے یہ مسجد تعمیر ہوئی اس زمانے سے لیکر ۱۸۵۷ء تک برابر اس مسجد میں مسلمان نماز ادا کرتے رہے اسمیں کبھی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، رام جنم بھومی مکتی سمیتی کی طرف سے مسجد کو مندر ثابت کرنے کی غرض سے جو کتابچہ شائع کیا گیا ہے وہ فرضی اور من گھڑت واقعات سے بھرا ہوا ہے یہ کہنا ہرگز درست نہیں ہے کہ رام جنم بھومی کی بازیابی کے لیے بابر، ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں تحریک چلائی گئی اور ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے مسجد کے اندر

ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی اجازت دی تھی۔ یہ سب باتیں مسجد کو بھرپینے کی پلیش بندی معلوم ہوتی ہیں۔ بادشاہ ہمایوں کو رانی درگاوتی نے راکھی باندھ کر اپنا بھائی بنلیا تھا اور اس نے رانی کی حفاظت کر کے اپنے بھائی بننے کا ثبوت دیا۔ اکبر کی ہندونوازی ساری دنیا میں بے مثل ہے اس نے ہندو راجاؤں کی لڑکیوں سے شادی کر کے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط بنایا۔ اپنی ہندو رانیوں کے لیے اس نے فتحپور سیکری کے اپنے محل میں مندر تک بنوائے تھے اگر اس وقت راجہ بیربل، ٹوڈر مل، اور مان سنگھ اس سے کہتے کہ آپ کے دادا نے ہمارے مذہبی رہنما بھگوان رام کے مندر کو توڑ کر اس پر مسجد بنوا دی ہے آپ اسے ہم لوگوں کو واپس کر دیجیے تو اکبر جیسا مذہبی تعصب سے پاک بادشاہ اس جگہ کو بخوشی ہندوؤں کو لوٹا دیتا کیوں کہ اکبر کی ہی اجازت سے راجہ ٹوڈر مل نے بنارس میں کاشی وشوناتھ مندر بنوایا تھا۔ اسی کے دورِ حکومت میں گوسوامی تلسی داس نے رام چرت مانس لکھی۔ اس نے اپنے وزیر فیضی سے مہابھارت اور ہندوؤں کی دیگر مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی مسلمان باقاعدہ طور پر

اس مسجد میں نماز ادا کرتے رہے بلکہ وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم، جارج پنجم و ششم کے زمانے میں بھی کبھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی اس طرح آزادی کے بعد بھی مسجد میں نماز پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا اور یہ مسجد مسلمانوں کے انتظام و انصرام میں رہی ۔ ۱۵۲۸ء سے ۱۹۴۹ء تک ۴۲۱ برس مسلمانوں نے اس مسجد میں نماز ادا کی ۔

۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں مہنت ابھے رام نے اپنے چیلوں کے تعاون سے اس زمانے کے کلکٹر کے کے نائر کو اپنی سازش میں لے کر مسجد میں مورتی رکھوادی جب مسلمان صبح فجر کی نماز ادا کرنے گئے تو انھیں مورتی رکھے جانے کا علم ہوا۔ انھوں نے ضلع انتظامیہ سے اس کی شکایت کی انتظامیہ نے مورتی ہٹوانے کے بجائے فرقہ پرستوں کا ساتھ دیا اور مسجد کو دفعہ ۱۴۵ کے تحت قرق کر کے سرکاری تحویل میں لے لیا، اور سٹی مجسٹریٹ نے مسجد کے صدر دروازے پر تالا لگوا دیا۔ فریقین کو اپنا ثبوت پیش کرنے کے لیے کہا گیا یکم جولائی ۱۹۵ کو شری جے این اگروال ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے عدالت میں ایک حلف نامہ داخل کرتے ہوئے اپنے دعویٰ کی دفعہ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ میں لکھا کہ یہ جائداد نزاعی بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے اور بہت عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمانوں

کے ذریعے عبادت کے لیے استعمال ہوتی چلی آرہی ہے،
اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کی حیثیت سے کبھی نہیں
ہوا۔

۲۲ دسمبر کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری سے
اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا، اس غلط او
غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہو گئی
اور اس علاقے میں نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اسی لیے
سٹی مجسٹریٹ گرودت سنگھ نے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو دفعہ
۱۴۴ نافذ کر دی اور اسی تاریخ کو ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ
شری مارکنڈے سنگھ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس مسجد کو
قرق کر کے ریسیور مقرر کر دیا۔

ایس پی سری کرپال سنگھ نے بھی اپنے جواب دعویٰ میں
اس کو زمانہ قدیم سے مسجد ہونا تسلیم کیا اور یہ بھی مانا کہ مسلما
اس میں ہمیشہ سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا ا
سے کوئی واسطہ و سروکار نہیں ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو کچھ ہندوؤں نے دعویٰ دائر کیا کہ
مسجد نہیں رام جنم بھومی ہے۔ یہاں ہم پوجا پاٹھ کرتے ہیں
مسلمانوں اور انتظامیہ نے اس میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔
اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہمیں پوجا پاٹھ کی اجازت دی جائے

اس دعویٰ سے ایک دن قبل انتظامیہ کی سازش سے مسجد کے باہر اکھنڈ کیرتن شروع کر دیا گیا تھا۔ عدالت سے حکم امتناعی جاری ہوا، اس کے خلاف مسلمانوں نے اپیل دائر کر دی اس کے بعد دو مقدمے ہندوؤں کی طرف سے اور ایک مقدمہ سُنی سنٹرل بورڈ آف وقفس اور عام مسلمانوں کی طرف سے دائر ہوا، سارے مقدموں کو اکٹھا کر کے اسے لیڈنگ کیس کر دیا گیا، ۳۵ سال سے اب تک اس مقدمہ کا کوئی تصفیہ نہ ہوا، ۳۵ سال سے کسی مقدمہ کا تصفیہ نہ ہونا جمہوری حکومت کے عدالتی نظام پر سے اعتماد کو کمزور کرتا ہے۔

۲۷ جنوری ۱۹۸۶ء کو امیش چند پانڈے نامی ایک وکیل نے فیض آباد کے منصف کے اجلاس میں ایک درخواست دی تھی جس میں تالا کھولے جانے اور پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت طلب کی، لیکن منصف نے ان کی درخواست اس بنا پر خارج کر دی کہ اصل مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر تجویز ہے لیکن یکم فروری ۱۹۸۶ء کو فیض آباد ضلع جج نے ایک عارضی حکم کے ذریعہ تالا کھولنے اور پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت دی اور ضلع انتظامیہ نے نصف گھنٹے کے اندر تالا کھول کر مسجد پر ہندوؤں کو قبضہ دلا دیا، مسلمانوں میں اس بات پر بے چینی پیدا ہوئی کہ ملکیت کا تصفیہ ہوئے بغیر تالا کیوں کھولا گیا۔ ان کا الزام ہے کہ سرکاری

وکیل ضلع جج، انتظامیہ اور صوبائی حکومت نے ایک طے شدہ سازش کے تحت ان کی سینکڑوں سال پرانی مسجد چھین لی ہے وزیراعلیٰ اتر پردیش جنت دیو ناتھ سے ملے ہوئے ہیں اور انھوں نے جان بوجھ کر الیکشن کرایا ہے، ایسی صورت میں وزیراعظم کو چاہیئے کہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا مسئلہ وہ خود طے کرائیں، اور مقدمے کے فیصلے کے لیے جنوبی ہندوستان کے ججوں کی تقرری کی جائے۔

جہاں تک مسلمانوں کی حکومت کا سوال ہے محمد غوری سے بہادر شاہ ظفر تک سینکڑوں برس اس ملک پر مسلمانوں نے حکومت کی اگر وہ واقعی ہندوؤں کے دشمن ہوتے تو آج اس ملک میں ایک بھی قدیم مندر دکھائی نہ دیتا۔ مندروں کی دیکھ بھال کے لیے بادشاہوں کے فرمان آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عدل وانصاف کا قتل

پی، ایس، سری دھر مورتی
(ایڈوکیٹ)

اجودھیا کی مسجد بابری مسجد اس لیے کہلاتی ہے کہ یہ ۱۵۲۸ء میں شہنشاہ بابر کی ہدایت پر بنائی گئی تھی، چند شرپسند فرقہ پرست، مسلم دشمن عناصر نے ۱۸۸۳ء میں رگھوبیر داس نامی ایک شخص کے ذریعہ اس پر اپنا ذاتی حق جتایا۔ اس نے فیض آباد کی سب جج عدالت میں ۱۸۸۵ء میں جنم استھان نامی چبوترہ تعمیر کرنے کے لیے دعویٰ دائر کیا۔ اس لیے کہ اس کو ڈپٹی کمشنر نے ۱۸۸۳ء میں اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ سب جج نے بھی اجازت نہ دی، یہ کہتے ہوئے کہ چوں کہ یہ مقام مسجد کے بالکل قریب ہے اس لیے ایسے مقام پر مندر کی تعمیر کی اجازت دینا فلاح عامہ کے خلاف ہوگا۔

رگھوبیر داس نے ضلع جج کے کورٹ میں اپیل دائر کی جنھوں نے ۱۷ مارچ ۱۸۸۶ء کے دن بذات خود اس موقع کا معائنہ کیا۔ اور اپیل مسترد کردی کہ مسجد ۳۵۶ برس پہلے بنائی گئی ہے اور اتنے زمانے کے بعد رگھوبیر داس کی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی اور کہا، "کوئی بھی نیا کام معاملات کو بگاڑ دے گا اور اس سے فضا اچھی ہونے کے بجائے اور خراب ہو جائے گی"

رگھوبیر نے اپنے آپ کو مہنت بتلا کر اودھ کے جوڈیشنل کمشنر ڈبلیو ینگ کے روبرو ۲۵ مئی ۱۸۸۶ء کے دن اپیل پیش کی جس کو یکم نومبر ۱۸۸۶ء کے دن مسٹر ینگ نے مسترد کردیا اور کہا "اس میں پیش کیے گئے جواز حقیقت سے دور ہیں اور کوئی بھی بحث قابل اعتبار نہیں"۔

اس فیصلے پر قانونی جنگ ختم ہوگئی، لیکن ۱۹۳۴ء کے فرقہ دارانہ فسادات میں اس مسجد کا کافی نقصان ہوا، ملے ہوئے دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے اس کے احاطے کی دیوار کو ڈھایا اور گنبدوں کو نقصان پہونچایا اور ایک گنبد میں سوراخ پڑ گیا حکومت نے اس کی مرمت کروائی۔

یوپی کے سرکاری گزٹ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۴۴ء کے مطابق کمشنر برائے اوقاف نے تحقیقات کرکے بتایا کہ یہ مسجد شہنشاہ بابر کی بنائی ہوئی ہے۔

سوا چار صدی بعد موجودہ تنازعہ کی بنیاد پڑی، چند شرپسند فرقہ پرست مسلم دشمن عناصر نے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کے بجرانی رات کے وقت خفیہ طور پر مسجد کے اندر بھگوان رام کا بت رکھ دیا۔ صبح کے نو بجے پولیس نے شکایت درج کی، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کے دن ضلع مجسٹریٹ کے نیّر نے ایک خفیہ ریڈیوگرام بھیجا جو درج ذیل ہے۔

چند ہندو رات کے وقت جبکہ مسجد غیر آباد تھی مسجد کے اندر گھس گئے اور ایک بت نصب کر دیا، ضلع مجسٹریٹ ایس پی اور عملہ مقام پر موجود تھے، معاملہ کنٹرول میں ہے، پولیس کے پندرہ نفوس ڈیوٹی پر موجود تھے لیکن انھوں نے مناسب کام نہیں کیا۔"

لازمی طور پر مسلمانوں کی طرف سے زبردست دباؤ ڈالا گیا کہ بت کو نکال دیا جائے اور پچھلی حالت کو بحال کیا جائے ہجوم کے ہجوم مسجد کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے اسی ۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ کے دن ضلع مجسٹریٹ کے کے نیّر نے بیان لکھا

لوگوں کے ہجوم نے زبردستی داخلے کی کوشش کی، تالے توڑ دیئے گئے اور پولیس والے ہٹ جانے پر مجبور ہو گئے، ہم تمام افسروں اور عملے نے کسی نہ کسی طرح ہجوم کو باہر کیا اور دروازہ

بند کر دیا، سادھو لاپروائی سے پولیس کے اور ہتھیاروں کے سامنے آ آ کر گرتے تھے اور بڑی مشکل سے ہم لوگ دروازہ تھام سکے۔ دروازہ بند کیا گیا اور باہر سے منگوا کر تالا ڈالا گیا اور پولس کا عملہ بڑھا دیا گیا۔ (شام کے ۵ بجے)

یہ تالا اس کے ۳۷ برس بعد عدالت کے دیئے گئے ایک غلط اور غیر منصفانہ اور غیر قانونی درمیانی حکم کے ۴۰ منٹ کے اندر توڑ دیا گیا جو یکم فروری ۱۹۸۶ء کے دن غیر معمولی حالات میں دیا گیا ہر سمجھدار شہری مانے گا کہ انصاف کے اصول کو ایک فرقہ پرست مقصد کے لیئے غلط طریقے پر استعمال کیا گیا ہے اور قانون کی خلاف ورزی کی گئی جو درج ذیل لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

(۱) عرضی یوسی پانڈے نامی ۲۸ سالہ وکیل کی طرف سے فیض آباد کے ضلع جج کے ایم پانڈے کی عدالت میں داخل کی گئی، جس پر ضلع مجسٹریٹ آئی کے پانڈے نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ان کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی ذات و ذیل سے تعلق رکھتے ہیں

(۲) عرضی دار یوسی پانڈے مقدمے میں ملوث نہیں تھا اور مقدمے کے دائر ہونے کے وقت ۱۹۵۰ء میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور مقدمے کے لیے بالکل غیر متعلق تھا۔

(۳) مقدمے کی فائل جج کی عدالت میں موجود نہیں تھی بلکہ ہائی کورٹ سے منگوائی گئی تھی۔

(۴) حالانکہ پانچ مدعا علیہ مسلمان تھے، کسی کو بھی یوسی پانڈے کی عرضی کی اطلاع نہیں دی گئی۔

(۵) محمد ہاشم کو اس مقدمے میں شامل ہونے کا یوسی پانڈے سے زیادہ حق تھا۔ لیکن ان کی شمولیت کی عرضی رد کردی گئی۔

(۶) عرضی کی سماعت سے پہلے وشو ہندو پریشد کے لیڈر، ہائی کورٹ کے دو سابق جج ایچ۔ این کانجو اور بی، این اگروال اور سابق ڈائرکٹر جنرل آف پولیس ایس دکشت نے متعلقہ جج سے ۱۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کے دن ملاقات کی اور بت کے درشن کی آرزو ظاہر کی تھی۔

(۷) وشو ہندو پریشد نے احتجاج شروع کردیا تھا۔ اور رام جنم بھومی کی آزادی کا اعلان کیا تھا، جس کا پہلا نعرہ "تالا کھول دو" تھا جو بعد میں "تالا توڑ دو" میں بدل گیا۔ اور بھگوان رام کے بت کے ساتھ موٹروں کے رتھ نکالے گئے تاکہ ہندوؤں کو جگا کر آزادی کی جنگ کے لیے یکجا کیا جائے اور اس کے لیے ۹ مارچ کی تاریخ مقرر کی تھی۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ حکومت یوپی اور حکومت ہند نے عدالت میں اپنی ذمہ داری نہیں نبھائی اور ایک مسجد کے برائے نام مندر میں تبدیل ہونے کا موقع دیا اور انصاف کے اصولوں کو پیچھے ڈال کر اس بے انصافی کو جاری رکھا۔

فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ کی ایک اہم مثال بابری مسجد ہے جس میں حال ہی میں دیوار پر نقش و نقوش بنائے گئے اور جس میں رام کی مورتی بزور طاقت رکھ دی گئی تھی۔ دیوار پر بنی ہوئی تصویروں میں سے ایک تصویر ایسی ہے جس میں بابر کے سپاہیوں کی ہے۔ جو فرضی رام مندر کو ظاہر کر رہے ہیں اور ہندوؤں کو ذبح کر رہے ہیں دیوار پر بنی یہ تصویر اس فرضی واقعے پر بنائی گئی ہے جس کے مطابق بابر کے سپاہیوں نے ایودھیا پر حملہ کر کے ۷۵ ہزار ہندوؤں کو قتل کیا اور رام جنم بھومی مندر کو توڑ دیا تھا اور اس کی جگہ بابری مسجد تعمیر کی تھی جس میں ان ہندوؤں کا خون گارے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ یہ کہانی بالکل غلط ہے کہ رام مندر بابر نے منہدم کیا تھا اور اس کی جگہ اس نے بابری مسجد تعمیر کی۔

پروفیسر رام سرن شرما
(ممبر انڈین کونسل فار ہسٹوریکل ریسرچ)

رام مندر

کوئی تاریخی ثبوت نہیں

نیلا دری بھٹا چاریہ

اجودھیا تنازعے کے بارے میں انگریزی میں ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "اناٹومی آف کنفرنٹیشن دی بابری مسجد رام جنم بھومی اشو" جسے سروپلی گوپال نے ترتیب دیا ہے اور مشہور پبلشر وائکنگ پینگوئن میکس انڈیا نے شائع کیا ہے، یہ دراصل کئی ممتاز مورخین اور اسکالروں کے مضامین کا مجموعہ ہے کتاب پر انگریزی کے بڑے اخبارات میں تبصرے شائع ہو چکے ہیں نیلا دری بھٹا چاریہ نے

بھی اس کتاب کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جس کے اہم حصوں کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔"

رام جنم بھومی تنازعہ میں کلیدی اہمیت تاریخ اور مفروضات کے متضاد مختلف تصورات اور سماجی رویوں سے ان کے رشتہ کو حاصل ہو گئی ہے۔ مورخین اس خیال کے حامل ہیں کہ وشو ہندو پریشد کا دعوئی قابل اعتراض تاریخی ثبوت پر مبنی ہے۔ آج کی ایودھیا کی تاریخی حیثیت متنازعہ فیہ ہے۔ کسی تاریخی ریکارڈ سے رام کی اصل جائے پیدائش کا سراغ نہیں ملتا، اور نہ ہی اس کا کوئی تاریخی ثبوت ملتا ہے کہ بابری مسجد کسی رام مندر کو منہدم کر کے تعمیر کی گئی ہے۔

تاہم وشو ہندو پریشد کے دعوؤں پر کی گئی اس تنقید سے کتنے ہی جو مطمئن نہیں ہیں، غیر مطمئن لوگوں میں شامل تمام وہ نہیں ہیں جو کٹر قسم کے ہندو ہوں یا ہندو پریشد کے پر جوش حامی ہوں۔ ماضی کے تعلق سے معروف تصورات کی تعمیر و تشکیل اکثر ان ہی مفروضات کے حوالوں سے ہوتی ہے ان تصورات کے پیچھے مفروضات ہی کو حقیقت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور غیر فرضی اور تقدس کا و نیریک سے پاک تاریخی ریکارڈ غلط ہوتے ہیں۔ ہم اس نوع کی اساطیری روایات کو نظر انداز نہیں کر سکتے

ہم تاریخ کو سچائی اور اساطیر کو فریب کے ہم قرار نہیں دے سکتے زندگی کو ایک نہج پر ڈالنے اور اپنے اعمال کو ایک رخ دینے کی غرض سے حصولِ علم کے متفرق ذرائع ہیں اور دنیا کو سمجھنے کے مختلف انداز اگر مفروضات پر لوگوں کا یقین و اطمینان ہوتا ہے تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟

اگر من گھڑت کہانیاں رواج پا جاتی ہوں اور عام تخیلات کو جلا بخشتی ہوں تو ہم محض یہ کہہ کر نہیں گزر سکتے کہ اس طرح کے قصوں کی نوعیت من گھڑت ہے بلکہ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ آخر یہ کیوں رواج پا جاتے ہیں اور اس کے اثرات عام تخیلات پر کیوں پڑتے ہیں۔

اس نوع کی فرضی کہانیوں کے واقعات حقائق اور سماجی کردار اپنا کوئی حقیقی تاریخی وجود نہیں رکھتے۔ ان میں کائنات کی ایک علامتی اور مجازی تصویر کشی ہوتی ہے اس طرح کی دیومالائی روایات کا اس غرض سے مطالعہ کہ اس سے واقعات کی تاریخی حقیقت معلوم کی جائے ایک عمل عبث سے زیادہ کچھ بھی نہیں، ہاں اس سے ان کا ذہن سمجھنے میں ضرور مدد ملتی ہے جنہوں نے اس طرح کی دیومالائی روایات کو جنم دیا ہے اور اس معاشرے کی اقدار پر روشنی پڑتی ہے جو اس طرح کی دیومالائی روایات پر یقین رکھتا ہے سماجی عمل کے ذریعہ کسی سماج میں جب سے ان دیومالائی

روایات کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت سے ایک ہی روایت کی متعدد تعبیریں پائی جارہی ہیں ہر تعبیر کے مطالب مختلف ہیں یعنی نیک و بد کے علامتی اظہار کی شکلیں متفرق ہیں، ایک ہی طرح کے کردار متضاد و مختلف نوح کی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، اگر ہم ایک روایت کی مختلف تعبیروں کا باہمی تقابل کرائیں اور اس کی توضیحات و تشریحات کی نیز اس میں جو کچھ تبدیلیاں اور ترمیمیں ہوئی ہیں ان کا جائزہ لیں تو ہمیں وہ معاشرے سمجھ میں آسکتے ہیں جو اس طرح کی روایات کے پاسدار ہوتے ہیں نیز یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ کسی مخصوص معاشرے میں یہ اساطیری روایات کیا کردار ادا کرتی ہیں۔

دوبارہ سہ بارہ توضیحات کا یہ عمل اکثر منافقانہ رنگ لیے ہوئے ہوتا ہے، ایک روایتی قسم کے معاشرے میں جو اساطیری روایات کے سہارے چلتا ہو، سماجی ڈھانچہ کی تعمیر و تشکیل جدید نالت اساطیری روایات کی تنقید کے حوالے سے ہوتی ہے موجودہ روایات بہر حال میں مسترد نہیں ہوجاتی ہیں بلکہ ان محتاط قدروں میں کچھ تبدیلیاں روبہ عمل لائی جاتی ہیں۔ اس روایت کے مختلف مفاہیم کو قابل قبول حد تک باقی رکھا جاتا ہے۔ پرانی روایتوں کی جگہ نئی روایتیں آجاتی ہیں، جوابی روایتوں کا جنم ہوتا ہے اور ان روایتوں میں پوشیدہ اہم کڑیاں بدل دی جاتی ہیں۔ پھر

لوگوں کو ان اساطیری داستانوں سے مانوس کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے اجنبیت دور کرنے اور مانوس بنانے کے اس عمل سے اساطیری داستانوں کے تئیں لوگوں کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے اور اب اس پس منظر میں نئے فسانے بنے جاتے ہیں جب ایک بار لوگوں کا ان داستانوں سے رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو پھر فسانہ جو بظاہر معقول نظر آتا ہے قابل اعتماد و یقین ٹھہرتا ہے ہمیں اس اساطیری عمل کو سمجھنا چاہیے۔ ہمیں جدید سیاسی من گھڑت داستانوں اور سماجی و سیاسی رویوں، جن کے درمیان من گھڑت کہانیاں جنم لیتی ہیں ان کے باہمی رشتوں کا جائزہ لینا چاہیے کیوں کہ اس اتصال سے ان افسانوں کو وجہ جواز حاصل ہوتی ہے۔ اساطیر کی اس قانونی حیثیت کو مبرہن کرنے کے بعد ہی ہم اس کوشش پر انگلی اٹھا سکتے ہیں جو انھیں لازوال اور غیر متبدل قرار دینے کے لیے ہوتی ہے۔ اسی صورت میں ہم اس جواز کو قابل مذمت گردان سکتے ہیں جو سیاست اس سے حاصل کرتی ہے۔

بہر حال وشو ہندو پریشد کے جنم استھان سے متعلق دعوے محض اساطیر و اعتقادات ہی پر ٹکے ہوئے نہیں ہیں ان کی پوری منطق کا ایک جز تاریخی مبالغہ آرائی بھی ہے۔ جنم استھان سے متعلق جو روایتیں پائی جاتی ہیں انھیں باصرار "تاریخ" کے بطور پیش کیا جاتا رہا ہے اور یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ان واقعات کے

پیچھے تاریخی شہادتیں موجود ہیں اس تنازعہ پر ہوئے تمام مباحث میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشوہندو پریشد مسلسل یہ کہتے رہے ہیں کہ انھیں تاریخ پر یقین ہے اور انھیں تاریخی شہادتوں کے تقدس کا خیال ہے۔

تاریخی حقائق اس شخص کے لیے جو تاریخیت کے مرض میں مبتلا ہو تو افسانہ معلوم ہوں گے لیکن اس کے لیے ہرگز نہیں جو متوازن ہو اور جس کو کسی بدمزگی کا خدشہ نہ ہو کہ معاملات اس کے حق میں جاتے ہیں یا خلاف تاریخی حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا انھیں محسوس کرنا ہوگا اور اختیار کرنا ہوگا الا یہ کہ کوئی اپنی آنکھیں ہی موند لے۔

جنم استھان کے متعلق جو عام اور مشہور روایتیں ہیں جو اکثر و بیشتر مورخین کے نزدیک غیر مستند قرار پاتی ہیں ان کے متعلق دعویٰ ہے کہ یہی "حقیقی تاریخ" ہے اس کتاب میں حقائق کو جوں کا توں پیش کیا گیا ہے ایک کتابچہ کے دیباچے میں یہ بات کہی گئی ہے اس میں "اجودھیا" کی ایک خیالی داستان "سرجو" ندی کی زبانی بیان کی گئی ہے اس میں دوسری کتابوں میں "سری رام جنم بھومی کا یکتر تجیت (اتہاس)" (مصنف رام گوپال پانڈے) اور اجودھیا کا پراچین اتہاس" (آچاریہ گدکنجی شرما) ہیں ان میں تاریخ نگاری کے تمام ضابطوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے تاہم کہنا یہ ہے کہ یہ مستند تاریخ ہے۔

شری رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمیتی نے اپنا الگ تاریخی و آثارِ قدیمہ کی شہادتوں پر مبنی نسخہ تیار کیا ہے۔ جسٹس دیوکی نندن نے اس سمیتی کے لیے ایک موثر تاریخی پمفلٹ تیار کیا ہے آرگنائزر جو اجودھیا میں رام مندر کی تعمیری مہم کو بڑے زور شور سے چلاتا رہا ہے اس نے متعدد بار رام جنم بھومی اور بابری مسجد سے متعلق ان تاریخی حقائق کو شائع کیا ہے جو اس کے نزدیک مستند ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پروپیگنڈہ پمفلٹ اور "معروف مشہور تاریخ" دونوں ہی میں حقیقی تاریخ اور مستند روداد کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے۔ تاریخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ واقعات کی کھتونی ہے اس سلسلہ میں "اتہاس ساکھشی" ہے (تاریخ گواہ ہے) کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ دشمن ہندو پریشد کی فراہم کردہ شہادتوں اور روداد کی تاریخ کرتی ہے تو یا ہمیں سچائی تک پہنچنے کے لیے تاریخ کی اس آواز کو سننا چاہیے ظاہر یہ شہادتیں مورخین کے طرزِ عمل اور نمونے سے مطابقت رکھتی ہیں کہ وہ تاریخی ریکارڈ کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اس طریقۂ استدلال میں حوالہ دینے کے طریقے کو حوالے کے طور پر پیش کیے گئے ریکارڈ کی نوعیت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جہاں ضروری ریکارڈ کے وجود کا تصور کیا گیا وہاں ان کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ اس کی

نشان دہی بہت آسان ہے کہ جن ریکارڈ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ حقیقتاً موجود ہی نہیں ہیں تاہم یہ امر معنی خیز ہے کہ دعووں کو برحق اور معقول ثابت کرنے کے لیے حوالوں کو ضروری سمجھا گیا ہے

اس طرح کے بیانات دو قسم کے لوگوں کو اپیل کرتے ہیں ایک جانب وہ لوگ ہیں جنھیں مفروضات وعقائد عمل کی بنیاد ہوں گے دوسری جانب وہ ہیں جو اساطیر کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور تاریخی معلومات کے مختلف انداز اختیار کرتے ہیں اور جمہوری ردلیوں کو اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح یہ حکایات ایک طرف تو اساطیر وعقائد کی توثیق حاصل کرتے ہیں تو دوسری طرف تاریخ کا جواز۔ یہ دورِ جدید کی ایک حکمت عملی ہے جو مختلف الخیال افراد کو متحد کرنے کی غرض سے اختیار کی جاتی ہے یہ طرز استدلال اساطیر، عقائد اور تاریخ کے سلسلے میں مشکوک اور غیر یقینی طرزِ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔

درحقیقت تاریخ کا بار بار اظہار اور حوالہ بتاتا ہے کہ اعمال کے جواز اور دعووں کی صداقت کے سلسلے میں اساطیر اور عقائد کی قوت پر کلی بھروسہ و یقین نہیں ہے کیوں کہ جب اس سلسلہ میں پیش کیے گئے تاریخی حقائق کے استناد پر تنقید کی جاتی ہے تو فوراً وجہ جواز کے طور پر اساطیر و عقائد دات کا سہارا

لیا جاتا ہے جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ بابری مسجد کی تاریخ کا جائزہ لینے کے لیے مورخین کی کمیٹی تشکیل دی جائے تاکہ وہ عدالت کو کسی فیصلہ تک پہونچنے میں مددگار ثابت ہو تو آرگنائزر نے بڑے عجیب ڈھنگ سے اپنا ردعمل ظاہر کیا" ہندوؤں کے نزدیک یہ مسئلہ عقیدے کا مسئلہ ہے کہ بھگوان رام کی پیدائش وہیں ہوئی تھی جہاں آج بابری مسجد ہے کوئی حکومت یا عدالت اس کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتی"۔

جب جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مورخین نے وشو ہندو پریشد کے دعوؤں کی تردید شائع کی تو کے آر ملکانی (ہندو پریشد کے ایک مورخ) نے دوبارہ اپنا وہ استدلال دوہرایا اگر ہندو پریشد کے نزدیک تاریخ اور اساطیر میں کوئی فرق نہیں ہے تو پھر وہ کیوں مورخین کا طرز بیان اور تاریخ کی زبان استعمال کرتا ہے؟ جب رام جنم بھومی مہم کے لیے تاریخی حوالوں کی اتنی ہی اہمیت ہے تو پھر تاریخی ریکارڈ کے اسناد اور شہادتوں کے لیے اس قدر بحث و مباحثہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟

رام جنم بھومی کی جنگ دراصل ہندو بیداری اور تشخص کا حصول، ایک مشترکہ ہندو روایت کی تشکیل اور ہندوستان کے تمام دیگر طبقات پر ہندو اقتدار کی بالادستی قائم کرنے کی

وسیع سیاسی جدوجہد کا ایک جز ہے وشو ہندو پریشد کی سرگرمیاں اسی وسیع مناظر میں بامعنی قرار پاتی ہے۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان کا ایک اتحاد قائم کرنا جو خود کو ہندو کہتے ہیں وشو ہندو پریشد کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے ان کا خیال ہے کہ ہندو مختلف چھوٹے گروپوں اور ذاتوں میں منقسم ہیں اور باہم متصادم بھی ہندوؤں کی ہی کمزوری نے بیرونی طاقتوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے اور حکمرانی کا موقع فراہم کیا نیز اقلیتوں کو سرکش و گستاخ بنا دیا۔ اقتدار کے دوبارہ حصول کے لیے ہندوؤں کو اپنی اس مشترک پہچان کے تئیں جس پر پردہ پڑ چکا ہے حساس ہونا پڑا ہے اور اس اتحاد کی بازیافت کے لیے کوئی کوشش کرنا پڑے گی جو معدوم ہو چکا ہے ہندوؤں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشترک تاریخی یادداشتوں پر لبیک کہیں روحانی لحاظ سے ان کے دل یکساں طور پر دھڑکتے ہیں وہ مشترک خونی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں ہندوؤں کو قومی و بین الاقوامی سطح پر متحد کرنے کا یہ منصوبہ ہندوستان کی مذہبی روایات کے درمیان تنوع اور اختلاف کو اصطلاح مذاہب کی رو سے روایات کی قوت و اہمیت کا نام دیا گیا اب اس نے نئے معانی اختیار کر لیے اب یہ معاشرے کی کمزوری کی علامت

بن گیا اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے ہندوؤں کو متحد و ہم آواز ہونا چاہیے اور ان کے درمیان اشتراک عمل بھی۔ لیکن کس مقصد کے لیے؟ ہر طرح کا اتحاد یکساں نہیں ہے ان کے مقاصد جدا جدا ہو سکتے ہیں اور اتحاد کی بنیادیں بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اس عملی اتحاد کو سمجھنا اہم ہے بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کے نزدیک اتحاد نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ ہندوؤں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے بلکہ ان کی بیداری کے لیے بھی ضروری ہے (ان میں ہندو جذبات کو بیدار کرنے کے لیے) رام جنم بھومی کی جدوجہد اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے سری رام جنم بھومی...... کو آزاد کرانے کی موجودہ تحریک دراصل قومی خود اعتمادی کے حصول کی جدوجہد ہے درحقیقت یہ قومی روح کو آزاد کرانے کی ایک مختصر مدتی جدوجہد ہے راج ماتا سندھیا نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ رام جنم بھومی کی سیاسی جدوجہد کا اصلی ہدف جاگرتی (بیداری) ہے ہندوؤں میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنا) ہندوؤں کو غفلت ترک کرنا ہوگا انھیں جمود پر قابو پانا ہوگا اور اپنے سوابھیمان (خودداری و خود اعتمادی) کو دوبارہ حاصل کرنا ہوگا اس کے لیے انھیں اٹھ کھڑا ہو جانا چاہیے اور حرکت و عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

یہ تحریک قدیم ہند روح کو بیدار کرنے کی لہنیں ہے اس کے تحت ہندوازم اور ایک اچھے ہندو کی از سرنو تعریف طے کی جائے گی وشو ہندو پریشد بھارتیہ جنتا پارٹی کے افراد کی تحریر و تقریر میں جارحانہ انداز اختیار کرنے کا بار بار ذکر ملتا ہے یہ سب سے پہلے آرگنائزر کے صفحات پر نظر آتے ہیں پھر بعد میں انھیں پمفلٹ کی شکل میں طبع کرایا گیا تاکہ بڑے پیمانے پر پھیلایا جا سکے۔ اس کا مصنف ایک غضبناک ہندو کی زبان سے ہندو غم و غصہ کے جواز اور وجود کو اس طرح بیان کرتا ہے

"ہاں یقیناً میں برہم ہوں اس کی وجوہ موجود ہیں اور مجھے اس کا ہر طرح سے حق حاصل ہے، دوسری صورت میں میں ایک انسان نہیں کہا جا سکتا، ہاں میں مدتوں سے اپنی بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرتا چلا آرہا ہوں نہ جانے کتنی مدت سے میں کسمپرسی کی حالت میں ہوں ہمارے لوگ دشمنوں کے ہاتھوں پس رہے ہیں، ہماری تعداد گھٹ رہی ہے ہمارا محبوب مادر وطن پارہ پارہ ہوکر رہ گیا اسی حال میں بھی تم مجھ سے کہتے ہو کہ برہم نہ ہو، اٹھ کھڑے نہ ہو جاؤ اور شور نہ مچاؤ، ہمارے مندر گرا دیے گئے تباہ کر دیے گئے ان کے مقدس ستھون کو حملہ آوروں نے پیروں سے روند ڈالا ہمارے دیوتا چیخ رہے ہیں ان کا مطالبہ ہے کہ ان کی پرانی شان و شوکت

بحال کی جائے جب میں درد و غم میں ڈوبی ہوئی داستان سناتا ہوں
تو تم سیکولرامن کے لیے خطرہ کہہ کر لعنت ملامت کرتے ہو، تم میرے
زخموں میں بی۔ج۔پی کا ایک داغ اور لگا دیتے ہو تم میرے دکھے اور
زخمی دل پر نمک پاشی کرتے ہو، تمھارے لیے تو قومی زندگی سیکولرازم
کا نام ہے جس میں سب کچھ تو ہے لیکن ہندوئیت کا شائبہ تک
نہیں ہے تمھارا مقصد یہ ہے کہ تم مجھ سے میری اصل پہچان چھیننا
چاہتے ہو صاف لفظوں میں بتادو کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں یونہی
خاموشی سے بیٹھا ہر طرح کی بی۔ج۔پی اور استحصال کو دیکھتا رہوں؟
کیا تم یہ کہنے کی ہمت کر سکتے ہو کہ (اس حال میں بھی) مجھے غضبناک
ہونے کا حق نہیں ہے؟ ایسے میں تو ایک کیڑا بھی بکھر جاتا ہے کیا
تم مجھے اس کیڑے سے بھی گرا ہوا سمجھتے ہو؟ مجھے اس پر یقین ہے کہ
دوسرے بھی ہمارے دیوتا اور مندروں کی ویسی ہی تعظیم کریں گے جیسی
کہ میں ان کی کرتا ہوں، میں مانتا ہوں کہ سخاوت سخاوت کو جنم دیتی
ہے لیکن افسوس کہ مجھے بار بار دھوکہ دیا گیا میری پیٹھ میں خنجر اتار
دیا گیا میری شرافت نے مجھے کو نقصان پہونچا دیا اب میں دنیا کی ریت
پہچان چکا ہوں اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ لوگوں سے اسی زبان میں
گفتگو کی جائے جس کو سمجھتے ہیں بالآخر مجھ پر برہمی اور غضبناکی کی قدر
واضح ہو گئی"۔

صبر، تحمل اور سخاوت کبھی ہندوؤں کی صفات سمجھی جاتی تھیں یہ انھیں دوسروں سے ممیز کرتی تھیں اب وہ صفات کمزوری کی علامت سمجھی جانے لگیں۔ اب انھیں جمود و تعطل اور مردہ دلی کی وجہ سمجھا جانے لگا۔ عصری چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئے اقدار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر جارحیت اور غضبناکی کی قدر محسوس کی گئی انھیں مردانہ صفات کا حامل سمجھا گیا جب کہ تحمل و بردباری کو زنانہ اوصاف قرار دیا گیا اول الذکر کو قوت کا سرچشمہ اور موخرالذکر کو کمزوری کا سبب بتایا گیا۔ برہمی وجارحیت سے آگے انتقام کی سیاست کا معاملہ آتا ہے کہا گیا کہ ماضی میں ہندوؤں کو مختلف قسم کی بے عزتیوں اور استحصال کا شکار کیا گیا ہے اب وقت آگیا ہے کہ ماضی کی ناانصافیوں کا بدلہ چکایا جائے۔

رام جنم بھومی کی جدوجہد میں انتقام کا نظریہ داخل کیا گیا منطق بہت سادہ ہے کہ جب مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں پر ظلم ڈھایا ہے تو آج اس کی پاداشں میں تمام مسلمانوں کو سزا بھگتنا پڑے گی اگر ماضی میں ہندو مندروں کو ڈھایا گیا تو مساجد کو آج ڈھایا جائے گا مساجد (بابری مسجد جیسی) کو ہندوؤں کی غلامی کی علامت سمجھا جاتا ہے اس لیے ان کا انہدام ہندوؤں کی آزادی کی جدوجہد کے لیے ضروری تصور کیا گیا۔

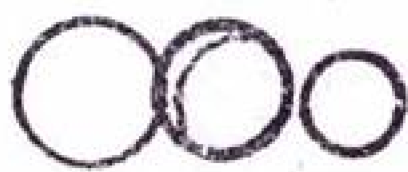
قدیم روایات میں رام کو ایک قوت و طاقت والا دکھایا گیا ہے لیکن ضبط نفس کا حامل انھیں مریادا پرشوتم (فوق البشر) کہا گیا ہے لیکن ساتھ ہی رقیق القلب بھی۔ رام کی اس تصویر کو جارح مردانگی کا پیکر اور جنگجو دیوتا کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا اسی طرح شیو کی موت، تباہی اور انتہائی غیظ و غضب کا دیوتا کی تصویر بنائی گئی۔

اس کی دہائی سے فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کا کام شروع کیا گیا جنوری ۱۹۸۱ء میں شیموگہ (کرناٹک) میں پہلا ہندو سماج اتسو (ہندو اتحاد کانفرنس) ہوا اس کے بعد سے ہندو پریشد نے ملک کے طول و عرض میں اس نوعیت کے متعدد اتسو کرائے۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں دہلی میں وراٹ ہندو سمیلن ہوا۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں کنیا کماری میں ہندو جاگیرتی ایکتا سمیلن ہوا۔ اسی نام سے دوسرے سمیلن (رانچی) ۸۲ء ترویچی (۱۹۸۸ء) اور الاندی مہاراشٹر میں ہوئے۔

فرقہ واریت پر مبنی پروپیگنڈے کے لیے جلوسوں رتھ یاتراؤں کو مذہبی رسم کے طور پر مستقل اہمیت دے دی گئی، جن جاگرتی ابھیان' وشال ہندی ایکتا یاترا' ایکاتمتا یاترا' رام رتھ یاترا اس کے دوسرے اجزاء تھے۔ زمین (متبرک اینٹیں) پانی (گنگا کا جل) آگ (مشال) خون اور مردوں کی راکھ کے ذریعہ اتحاد کے نئے اقرار نامے کو

کو مستحکم و پائدار کرنے کی کوشش کی گئی۔

رام جنم بھومی کی سیاست حقیقتاً فرقہ واریت پر مبنی ایک قسم کا جوبی اتحاد پیدا کرنا ہے یہ ہندو تشخص کو ایک جارح اور مردانہ تشخص کا روپ دینا چاہتی ہے اس کی زبان انتقام اور بدلہ کا انصاف کی زبان ہے، رام جنم بھومی کی سیاست ہندو ریاست، مذہب من گھڑت کہانیوں، رسوم ورواج اقدار اور ضوابط کا دفاع نہیں ہے بلکہ در اصل یہ فرقہ واریت پر مبنی ہے سیاست کو موفر الذکر چیزوں کے سہارے جواز فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے یہ فرقہ وارانہ انداز میں ان روایات کا استعمال ہے اس طرح روایات و مذہب کو فرقہ وارانہ اور سیاسی رخ دینا اور ان کی شکل کو تبدیل کر دینا ہے اور یہ مذہب و روایات دونوں کو بے معنی اور کھوکھلا کرنے کے مترادف ہے۔



بابری مسجد

ایک تاریخی جائزہ

نیناویاس (خصوصی نامہ نگار روزنامہ ہند)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اجودھیا تنازعہ میں ووٹ بینک کی سیاسی منفعت کے علاوہ کوئی اور نکتہ سنجیدہ غور و فکر کے لائق نہیں ہے۔ مذہب کے نام پر ہیجان انگیزی کے اس عمل نے ملک کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے اور پہلے سے منتشر سماجی ڈھانچے کے مزید بکھر جانے کا شدید اندیشہ لاحق ہو گیا ہے اب یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی کہ وہ تہذیب جیسے بجا طور پر پانچ ہزار سال قدیم تاریخ پر فخر ہے وہاں اب یہ لایعنی مسئلہ زیر غور ہے کہ کیا اسے اپنی تاریخ کے ایک صفحہ پہ سیاہی ملنی ہوگی، کیا اقتدار کی ہوس ہماری بنا

پارٹیوں کو اس قدر اندھا بنا دیتی ہے کہ وہ ساڑھے چار سو سالہ قدیم کسی عمارت کے انہدام کی خواہش مند ہو جائے؟

بابری مسجد جیسی تاریخی عمارت کو محفوظ رکھنے کے مطالبے کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت نہ صرف اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ ایک گروہ کی عبادت گاہ پچھلے ۴۶۰ (۱۵۲۸ تا ۱۹۸۸ء) سالوں سے چلی آرہی ہے، اس کے تحفظ کی ضرورت صرف اس کے مسجد ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اگر وہ اصطبل بھی ہوتا تو اس صورت میں بھی اسے محسوس کیا جاتا۔

آج کسی سیاسی پارٹی کے پاس ملک کو درپیش چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لئے کوئی مربوط لائحہ عمل موجود نہیں ہے اس صورتحال میں یہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مذہب اور ذات پات کے مذموم جذباتی عنوان سے عوام کو بھڑکایا جائے، بھارتیہ جنتا پارٹی نے مندر مسئلے کے تصور سے اپنی نئی بیانت (قوت) کے ساتھ سفر کا آغاز کیا ہے، منڈل معاملے نے وی، پی سنگھ کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔ اب "مسجد" اور "منڈل" کو باقی رکھنا ان کے لیے بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے اور کانگریس (آئی) ان تینوں کے درمیان گردش کر رہی ہے، ایک جانب مندر مسجد منڈل کی سیاسی کھچڑی سے ایک بھوکے ملک کی ضیافت ہو رہی ہے تو دوسری جانب

فرقہ واریت اور دہشت گردی کی شکل میں روز افزوں سیاسی رجحان، ہلاکت خیزی کے لیے مرچ مصالحوں کا کام کر رہا ہے آیئے ذرا اجودھیا تنازعے کے مباحث کا جائزہ لیں اور اس سے متعلق فریقین کے دستاویزی ثبوت کو جو حکومت کے حوالے کیے گئے ہیں، دیکھیں نیز یکم دسمبر سے اب تک تین مرحلوں میں ہوئی گفت و شنید پر، جو وشو ہندو پریشد یعنی بی جے پی کے دوسرے بازو اور نام نہاد ہندو نقطۂ نظر کی نمائندہ۔ اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی۔ جو اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے اظہار خیالات کی مدعی ہے کے درمیان ہوئی۔ نظر ڈالیں۔ حکومت کے نمائندہ نائب سبودھ کانت سہائے، وزیر مملکت برائے داخلی امور نے ان نشستوں کی صدارت کی اور بتایا کہ حکومت ان معاملات میں بالکل غیر جانب دار رہی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندو پریشد اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئی ہے ۲۳؍ دسمبر کو اپنے دستاویزی ثبوت حکومت ہند کے علاوہ کرتے ہوئے وی ایچ پی نے واضح انداز میں بتایا کہ اس کے نزدیک اصل اور متعلقہ مسئلہ کیا ہے پریشد کے نمائندوں نے اپنی دستاویز میں جو نوٹ لکھا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

"غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا رام کے عقیدت مندوں کے درمیان

یہ روایت تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے کہ اس وقت جہاں بابری مسجد کھڑی ہے وہ رام کی پوتر جائے پیدائش ہے اور کیا وہاں مسجد کی تعمیر سے پہلے یا تعمیر کے وقت کسی مندر میں رام کی پوجا ہوئی ہے"۔

اس سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو پریشد آثار قدیمہ کے شواہد کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ ۱۵۲۸ء یعنی بابری مسجد کی تعمیر سے متصلاً وہاں کوئی مندر تھا جس میں رام کی پوجا ہوتی تھی۔

پریشد کا دعویٰ ہے کہ اس نے جو ثبوت پیش کیا ہے اس سے ثابت ہو جائے گا کہ متذکرہ سوال کا جواب اثبات میں ہی ہونا چاہیے ہندو پریشد کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ خود اپنے جال میں پھنس گئی ہے تو اس نے فوراً اپنا موقف تبدیل کر لیا۔ کچھ لوگوں کی طرف سے یہ مشورہ دیا گیا کہ اگر وی ایچ پی یہ ثابت کر دے کہ اس مقام پر پہلے کوئی مندر تھا، اس صورت میں اس کے لیے یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ وہاں رام کی پوجا ہوتی تھی، اب ان کے ایک ترجمان ڈاکٹر ایس، گپتا۔ سابق ڈائرکٹر الٰہ آباد میوزیم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی کہ وہاں شیو کا مندر تھا وی۔ ایچ۔ پی اپنے دعویٰ سے منحرف نہیں ہو سکتی تاہم اس موقف کی تبدیلی کے بعد بھی ہندو پریشد خود کو علم آثار قدیمہ اور تاریخ کے گرد گھیرے ہوئے تھا

ہوا محسوس کر رہی ہے۔

اب مسجد کے معاملے کو لیجئے۔ میر باقی جس نے مسجد کی تعمیر کی ہے ایک کتبہ میں فخریہ کہتا ہے کہ مسجد کی تعمیر شہنشاہ بابر کے حکم پر عمل میں آئی ہے لیکن اس میں کسی مندر کے انہدام کا تذکرہ نہیں ہے ایک بت شکن کے لیے یہ عمل ایک مذہبی فریضہ کا درجہ رکھتی ہے اگر ایسا ہوتا تو اس کے تذکرے سے کیوں احتراض برتا جاتا۔ ابوالفضل دوربار اکبری کا ایک وزیر) آئین اکبری میں جو غرض انہدام کی بتائی جانے والی مدت کے ستر سال بعد لکھی گئی ہے اجودھیا کا ایک زیارت گاہ کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے لیکن اس میں رام کی یقینی جائے پیدائش کا ذکر نہیں ملتا اور پھر کیا رام کے بڑے عقیدت مند تلسی داس جنھوں نے عہد اکبری میں جو غرض انہدام کی بتائی جانے والی مدت کے ستّر سال بعد لکھی ہے، اجودھیا کا ایک زیادت گاہ کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے لیکن اسمیں رام کی یقینی پیدائش کا ذکر نہیں ملتا اور پھر کیا رام کے بڑے عقیدت مند تسی داس جنھوں نے عہد اکبری میں "رام چتر مانس" کی تخلیق کی جب بابری مسجد کی تعمیر کو زیادہ دن نہیں گذرے تھے، اس کا تذکرہ بھول گئے کہ رام کی جائے پیدائش پر موجود مندر کو منہدم کر کے اس کو ہندوؤں یعنی رام کے عقیدت مندوں سے چھین لیا گیا ہے۔ درحقیقت وشو ہندو پریشد کسی بھی بنیادی

ماخذ سے (۱۷ ویں صدی) کے اختتام تک کے ماخذ، کوئی ایک ثبوت بھی نہیں پیش کر سکی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں (جہاں اب بابری مسجد کھڑی ہے) کوئی مندر موجود تھا یا کہ "رام مندر" جس کو منہدم کیا گیا ہو۔

وشو ہندو پریشد کا کلیدی ثبوت ۱۸ ویں صدی کی وہ تحریر ہے جس کو اورنگ زیب کی نواسی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اس میں چند بڑے مندروں کے انہدام کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان منہدم شدہ مندروں میں جو اودھیا کا رام مندر بھی شامل ہے مورخین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ بابر کی طرف سے منسوب اس عبارت میں جس میں اس نے اپنے بیٹے کو اپنی ہندو رعایا کے ساتھ رحم دلی کے سلوک اور ان کے مذہب کے احترام کی نصیحت دی ہے یقیناً غیر مستند ہے اور یہ مخصوص حصہ مسخ شدہ عبارت معلوم ہوتی ہے یہ ٹکڑا جو کہ "صحیفہ چہل نصائح بہادر شاہی" سے ماخوذ بتایا جاتا ہے اور اس کا انتساب بہادر شاہ عالم گیر کی صاحبزادی کی طرف فرض کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو دوسرے مورخین کی طرف سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بہادر شاہ عالم گیر نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا ہے اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۶۵۹ء تا ۱۷۰۷ء اور ان کے صاحبزادے بہادر شاہ نے ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک حکومت کی

مرزا جان کی ۱۸۵۷ء کی ایک تحریر میں یہ عبارت ان کی ہے

مرزا جان کا شمار مورخین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ عبارت کس سے نقل کی ہے لیکن انہیں معلوم جہاں سے اسے نقل کیا گیا ہے اس کی مصنف کون ہیں اس لیے اس کی جستجو لاحاصل ہے وہ اس قدر ناواقف ہے کہ اورنگ زیب اور ان کے صاحبزادے بہادر شاہ تک میں تمیز نہیں کر پاتا ہے ان مورخین کے علاوہ مسٹر آر. ایس شرما سابق چیرمین انڈین کاسنل آف ہسٹاریکل ریسرچ نے چینی سیاح ہون سانگ کی ساتویں صدی کا جو دھیا آمد کا تذکرہ کیا ہے اس نے اپنے سفرنامے میں بتایا ہے کہ اس وقت یہاں بدھوں کا بول بالا تھا، نیز ان کے سو معبدوں کی فہرست دیتا ہے جبکہ صرف دس غیر بدھی معبدوں کا ذکر کرتا ہے اس کے بقول اس عہد کا اجودھیا برہمن رسوم ورواج کی آماجگاہ نہیں تھا۔ مسٹر شرما نے استدلال اور قوت کے ساتھ کہا ہے کہ بابری مسجد کے سیاہ ستونوں پر جو تصاویر (یکشا' دوار پالا اور برنا گھٹا کی) ہمیں نظر آتی ہیں وہ کسی ہندو مندر سے متعلق نہیں ہو سکتی ہیں ان میں کچھ تصاویر (مصوری) اب ہند اسلامی فن تعمیر کی روایت کا ایک حصہ بن گئی ہیں دہلی کی جامع مسجد لکھنو کے آصفی امام باڑہ نیز دور برطانیہ کے شاہی محلات میں ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے

دل چسپ بات یہ ہے کہ ہندو پریشد کے دعوے کے خلاف سب سے قوی ثبوت ۱۹۷۵ء کے دوران اجودھیا کی کھدائی ہے جو پروفیسر بی بی لال (اس وقت کے سروے آف انڈیا کے محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل) کی قیادت میں ہوئی تھی سامنے آتا ہے ایک طرف ہندو پریشد کا دعویٰ ہے کہ اس کھدائی نے اس کے کیس کو مضبوط کر دیا ہے لیکن حقائق کچھ اور کہتے ہیں مورخین نے الزام لگایا ہے کہ بی جے پی کے دباؤ میں آکر پروفیسر بی بی لال نے اپنے خیالات تبدیل کر دیئے ہیں لیکن اس سے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، اس کھدائی کی مستند رپورٹ اجودھیا تنازعہ سے پہلے جس کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا، انڈین آرکیولوجیکل ریویو میں شائع ہو چکی ہے اس قسم کی کسی دریافت کا تذکرہ نہیں ہے جس سے کسی مندر کے انہدام پر روشنی پڑتی ہے اس میں پورے ایقان کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ساتویں صدی سے پہلے یہاں آبادی کے آثار نہیں پائے جاتے۔ اسلامی چمکدار برتن کی داستان تیرہویں صدی سے پندرہویں صدی کے دوران کی ہے (کیا اس سے اس مقام پر مسلمانوں کے قبضے کا اشارہ ملتا ہے؟) قدیم ترین آثار ملتے ہیں وہ جین مت سے متعلق ہیں اور جو ساتویں صدی کی بات ہے۔

مسٹر شرما نے مسٹر لال پر زور دیا ہے کہ انھیں اپنی دریافت پر کھدائی کے دوران جس کا انھوں نے اندراج روزنامچوں میں کیا ہے اور تاریخی عمارتوں کے رجسٹر میں جس کو لکھا ہے قائم رہنا چاہیے اور اس سے منحرف نہیں ہونا چاہیے اگر واقعی کسی مندر کے وجود کا کہ رام مندر کا ثبوت ملا تھا تو اسے انھوں نے کیوں نہیں نوٹ کیا، ایسا تو خاص طور پر ہونا چاہیے کیوں کہ یہ کھدائی راماین پروجیکٹ کی تاریخ کا ایک حصہ تھی، یقیناً بی بی لال کھدائی کی مکمل رپورٹ جب کبھی شائع ہوگی تو حقیقت حال سے واقفیت ہوگی لیکن اس نے اس ثبوت سے بحث ضرور کی ہوگی کیوں کہ کھدائی کے دوران نوٹ بک اور تاریخی عمارات کا رجسٹر خود انھوں نے لکھا ہے ۔

ایک اور مورخ ڈاکٹر جے پرساد جین نے اپنے ایک مضمون "اجودھیا آدسی نیرتھ" میں بابری مسجد میں استعمال شدہ سیاہ ستونوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ قدیم جین مندروں کے ہیں، لال کرشن اڈوانی کی، ریسٹوریشنل یراتیڈ مہم (سابق صدر بی جے پی نے اکثر کہا ہے کہ اجودھیا مہم دراصل قومی مفاخر کا احیار ہے) بڑی تعجب خیز ہے کیا وہ یہ سفارش کریں گے کہ نئی دہلی کے حسین قطب مینار کو منہدم کر کے اسے جینیوں کے حوالے کر دیا جائے

کیوں کہ مورخین کا خیال ہے کہ کبھی یہ ہندو شدت پسند تاج محل کو تیجو محالیہ مندر قرار دے سکتے ہیں۔ یہ ہندو مندر تھا بادہ تجویز کریں گے کہ اس قطب مینار کی بھی باعزت منتقلی ہو جائے جیسی کہ وہ بابری مسجد کی چاہتے ہیں؟

لیکن ملک کے ۹۰ سے زائد معروف مورخین سوال کرتے ہیں کہ کیا تاریخ کو یوں ہی مسخ ہونے دیا جائے گا۔ کیا اسے بنیاد پرستوں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کے لیے کھلی چھوٹ دیدی جائے گی اور کیا حکومت یونہی تماشا بینی کا کردار ادا کرے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کو فرقہ واریت کی سیاست ہی بس ایک آسان راہ سمجھ میں آتی ہے ان کے پاس ملک کے بھیانک سماجی و معاشی مسائل کے حل کے لیے کوئی معقول اصول نہیں رہ گیا ہے آنے والے شورش زدہ حالات سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کے بجائے کیا وہ ہمیں دور وسطی کے حالات میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔

اجودھیا ۔ حقیقت یا افسانہ

ایین پانیکر

" اجودھیا تنازعے کے بارے میں مشہور مورخ کے این پانیکر کا جو مضمون حال ہی میں شائع شدہ کتاب " اناٹومی آف اے کنفرنٹیشن سے لیا گیا ہے اگرچہ بیشتر باتیں متعدد مورخین اور دانشوروں کی طرف سے پہلے ہی آچکی ہیں تاہم اسمیں بعض گوشے یقیناً نئے ہیں "

پچھلے چند برسوں سے وشو ہندو پریشد اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ جیسی ہندو تنظیمیں یہ دعویٰ کرتی چلی آرہی ہیں اجودھیا کی بابری مسجد رام جنم استھان پہ کھڑی ہے ... ں مہاراجہ بکرما دت کے زمانے کا ایک مندر تھا ۔ یہ بھی کہا گیا کہ ۱۵ میں اس مندر کو گرا کر مسجد کی تعمیر کی گئی ۔ اسمیں مندر

ء کے اجزار کا بھی استعمال کیا گیا ہے، ہندو پریشد کے خیمے کا ہر شخص اپنے خیال کی تائید میں تاریخی شہادت پیش کرنے کا مدعی ہے، ہندو پریشد وہ تنظیم ہے جو مسجد کو گرا کر مندر کی تعمیر کی تحریک چلانے کے لیے مظاہرے کرنے میں پیش پیش رہی ہے ۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ہندو پریشد نے حکومت ہند کو جو میمورنڈم پیش کیا ہے اس میں تاریخی شہادتوں ہی سے پوری بحث کی گئی ہے اور اعتقادات (مذہبی) کا مسئلہ اٹھایا ہی نہیں گیا ہے بابری مسجد تحریک رابطہ کمیٹی نے بھی خالص تاریخی بنیادوں پر ہندو پریشد کے دعووں کو رد کیا ہے۔

اس سلسلے میں اجودھیا کی تاریخ کی جانچ پڑتال مفید ہوگی بالخصوص اس تنازعے کے تین اہم نکات کی تحقیق۔ اولاً کیا یہ ثابت کرنا ممکن ہے کہ بابری مسجد ہی کا مقام دراصل رام کی جائے پیدائش ہے؟ ثانیاً ایسی کوئی معروف روایت ملتی ہے کہ یہاں کوئی مندر تھا یا اس کو منہدم کیا گیا؟ اگر واقعی ایسا ہے تو کیا علاقے کے ہندوؤں کی جانب سے کبھی اس کی بازیافت کا کوئی دعویٰ دائر کیا گیا اور اسے دوبارہ مندر کی شکل دینے کی کوشش کی گئی۔؟

موجودہ اجودھیا رام کی جائے پیدائش ہے یا نہیں جیسا کہ والمیکی نے بیان کیا ہے۔ یہ معاملہ شکوک و شبہات سے بالاتر نہیں ہے

رام کہانی کے واقعات بنیادی طور پر رام کتھا میں ملتے ہیں جس کا اب وجود نہیں ہے پھر اس کو والمیکی نے رزمیہ کی شکل میں رامائن میں لکھا گیا ہے، یہاں چونکہ یہ داستان نظم کی شکل میں بیان کی گئی ہے اس لیے اس کی بہت سی چیزیں بشمول نظام احوال اور کردار فرضی ہیں۔

روایتوں کے مطابق اجودھیا کے راجہ رام تریتا یگ میں پیدا ہوئے، یہ زمانہ کالی یگ سے ایک ہزار برس پہلے کا ہے ایک اندازے کے مطابق اس کا آغاز ۳۱۰۲ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ رامائن کی اجودھیا کی معاشرتی زندگی بڑی ترقی یافتہ اور خوشحالی نظر آتی ہے یہ ایک شہر تھا، یہاں شاندار محلات اور بہترین عمارتیں تھیں، یہاں کا طرز رہائش ایسا تھا جو کسی ترقی یافتہ دور کی غمازی کرتا ہے۔

لیکن رامائن میں اجودھیا کا جس انداز میں تذکرہ ملتا ہے اس علاقے کے آثار قدیمہ کی شہادتیں اس کی توثیق و تصدیق نہیں کرتی ہیں، اس علاقے میں دو کھدائیاں ہوئی ہیں۔ ایک اے کے نارائن کی نگرانی میں اور دوسری بی بی لال کے تحت۔ دونوں کھدائیوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اجودھیا میں آبادکاری کا آغاز نادرن بلیک پولشڈ وار کلچر کے ابتدائی مرحلے سے ہوا ہے

لال اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ جتم کیوسی کے علاقہ کی پہلی آبادی کا زمانہ ساتویں صدی قبل مسیح بتانا مناسب اور معقول بات ہوگی۔ اس آبادی کا ایک شہری زندگی کے بطور ترقی کرنا یقیناً بہت بعد کی بات ہونا چاہیے اور اسے چھٹی صدی کے اختتام یا پانچویں صدی کی پہلی نصف صدی کا معاملہ قرار دینا چاہیے اس زمانے میں گنگا کے میدانی علاقے میں اور دوسرے شہر بھی ملتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے بعد شاہی خاندانوں کی تاریخی دستاویز بہتر طور سے ترتیب دی گئی ہے اور موجود ہے اس زمانہ کے بادشاہوں کے جو نام ملتے ہیں ان میں دسرتھ اور رام کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر رامائن کے واقعات و ظروف کو تاریخی سند کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے تو ان واقعات کو پانچویں صدی قبل مسیح سے پہلے ظہور پذیر ہونا چاہیے لیکن مذکورہ بالا شواہد آثار قدیمہ کی روشنی میں یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں معلوم ہوتی ہیں۔

(د) شواہد شکوک وشبہات کو مزید تقویت بخشتے ہیں بدھ مت کے ذرائع کے مطابق کو شل عہد کے اہم شہری مراکز شراوستی اور ساکیت تھے۔ موخرالذکر سرجو ندی کے کنارے

آباد تھا۔ انہی کتابوں میں ایک شہر اجودھیا کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن وہ گنگا کے کنارے آباد تھا اور آج کی اجودھیا کی طرح سرجو پر نہیں تھا۔ مہاتما بدھ کا اجودھیا سے تعلق بھی ریکارڈ میں موجود ہے۔

گو کہ اجودھیا، ساکیت اور شراوستی کی طرح بہت اہم اور مشہور نہیں تھا لیکن ایسا غیر اہم بھی نہیں تھا ورنہ اندھا دھند اس پر حملہ آور نہیں ہوتے لیکن وہ اجودھیا سے مغربی ہندوستان کے شہر دوارا وتی کی طرف کوچ کر گئے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ یہ کچھ اور مغرب کی جانب واقع تھا جہاں کہ آج موجود ہے اگر ساکیت اور اجودھیا ایک ہی شہر کے دو نام ہوتے تو بدھ مت کے لٹریچر میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا کیونکہ الذکر ایک اہم مذہبی اور تجارتی مرکز تھا جہاں مہاتما بدھ اکثر و بیشتر آیا کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بکرما دت کے ایک راجہ غالباً اسکند گپت نے پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ساکیت کا نام بدل کر اجودھیا کر دیا کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وہ اپنی راجدھانی تبدیل کر کے ساکیت میں لے آیا تھا۔ اس طرح رزمیہ کی فرضی اجودھیا بہت آخر میں جا کر ساکیت میں ضم ہو گئی ہے۔

اجودھیا میں واقع تاریخی مسجد کو جسے عرف عام میں بابری مسجد

کہتے ہیں۔ بابر کے ایک امیر باقی نے ۱۵۲۸ء میں بنوائی۔
پانی پت کی جنگ کے بعد بابر نے علاقہ اودھ کا دورہ کیا۔ اس کی غرض اودھ کے معاملات کو طے کرنا تھا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ اجودھیا بھی گیا تھا۔ بابر نامہ میں اس کے اس علاقے میں قیام کے دوران کی سرگرمیوں کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں کیوں کہ اس زمانہ کا تذکرہ جن صفحات پر تھا وہ غائب ہیں اس لیے اس زمانے کی تفصیلات پر مبنی کسی عصری دستاویز اور شہادت تسلیم کرنا ہوگا جسیں ان حالات کا تذکرہ ہے جسمیں مسجد کی تعمیر ہوئی ان عبارتوں سے مذہبی جذبات شوق وولولہ انگیزی کا اظہار تو ہوتا ہے بالخصوص جب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حوالہ آتا ہے لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ مسجد کی تعمیر کسی مندر کے انہدام کے بعد ہوئی ہے اس قسم کا کوئی تذکرہ کسی اہم عصر فارسی دستاویز یا روزنامچوں میں نہیں ملتا اس نوع کی کسی تاریخی شہادت کی غیر موجودگی میں اس کی طرف توجہ مفید ہوگی کہ دیکھا جائے کہ بابر کا رجحان دیگر مذاہب کے تئیں کیا تھا۔ بابر نے اپنی یادداشت میں ان تمام چیزوں کے سلسلہ میں جن سے اس کو یہاں سابقہ پیش آیا بہت واضح اور دو ٹوک انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہاں ہمیں

دیگر مذاہب اور اعتقادات کے سلسلے میں کوئی اوچھا، دلآزار اور حقارت آمیز تذکرہ نہیں ملتا ہے اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے دور حکومت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ اس نے اپنی رعایا کے ساتھ مذہبی اعتقادات کی بنیاد غیر مساوی سلوک روا رکھا ہو بلکہ اس کے برعکس یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کا عام رجحان اور برتاؤ مختلف مذاہب کے تئیں مروت اور تحمل اور بردباری کا تھا۔

عہد وسطیٰ کی ایک فارسی دستاویز جس میں اجودھیا کا تذکرہ ہے وہ ابوالفضل کی تصنیف آئین اکبری ہے جو سترہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اس میں اجودھیا کو قرون سابقہ کی ایک متبرک جگہ اور رام چندر کی رہائش بتایا گیا ہے یہ رام چندر تریتا عہد کی ایک ایسی شخصیت تھی جو روحانی قوت اور شاہی جاہ و جلال کا مرجع تھی ابوالفضل کسی ایسے مندر کا تذکرہ نہیں کرتا۔ جو کسی ایسی ہستی کی طرف منسوب ہو جو روحانی اور دنیاوی قوتوں کا مرکب ہو نیز اس مندر کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا ہو اور نہ ہی وہ اس علاقے میں کسی مذہبی رنجش یا کشیدگی کا تذکرہ کرتا ہے

اگر ایک طرف فارسی دستاویز میں اجودھیا کے کسی مندر کے انہدام کا تذکرہ نہیں ملتا تو دوسری طرف ہندو لٹریچر بھی

اس سلسلے میں خاموش ہے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز خاموشی رام کے سب سے بڑے بھگت اور رام چرتر مانس کے خالق گوسوامی تلسی داس کی ہے۔

یہ خیال کہ بابری مسجد کی تعمیر دراصل ایک مندر کے انہدام کے بعد ہوئی ہے۔ حالیہ زمانے کی تخلیق ہے اس کی ابتدا سامراجی حکمرانوں کی برصغیر کی از سر نو تاریخ لکھنے کی تحریک سے ہوئی ہے از سر نو تاریخ لکھنے کے اس عمل میں بنیادی اہمیت قوموں کی مذہبی تاریخ اور ان کے مابین پائی جانے والی رقابتوں کو حاصل تھی۔ ظاہر ہے تاریخ فیض آباد کو استثنا کی صورت نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں تاریخ سے بحث کرنے والی سب سے پہلی سرکاری کتاب پی کارنیگی کی اے ہسٹوریکل اسکیچ آف تحصیل فیض آباد (۱۸۷۰) ہے اکارنیگی کا کہنا ہے کہ تصدیق شدہ مقامی روایتوں کے مطابق اجودھیا میں تین مندر تھے جن کو منہدم کرکے مغلوں نے ان کی جگہ پر مساجد تعمیر کرائے یہ گویا معروف محمڈن اصول کو جو علاقے ان کے قبضے میں آگئے وہاں وہ اپنا مذہب نافذ کر دیں۔ کے عین مطابق تھا کارنیگی کے اس قول کو ایچ، آر، نیول نے گزیٹیئر آف فیض آباد میں حرف بہ حرف نقل کر دیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔

اے۔ ایس۔ بیوریج نے غالباً انہی بیانات پر بھروسہ کر کے یہ کہا کہ مندر کا مسجد میں تبادلہ، بابر کے ذریعہ ہوا۔ حالاں کہ بابر نامہ میں اس طرح کا کوئی بیان درج نہیں ہے جس کا کہ اس نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ بابر —— ایک مسلمان تھا لیکن اس کو ہندوؤں کے قدیم مقدس مقامات کا خیال بھی تھا اس کی وہ عزت بھی کرتا تھا اس کے باوجود اس نے مسجد کی تعمیر کی غرض سے کم از کم مندر کا ایک حصہ ضرور گرایا ہے۔

وہ تمام مقامی روایتیں جن پر برطانوی حکام کا تکیہ ہے اور جنہیں جدید دانشوروں نے بطور سہارے پکڑ رکھا ہے اپنے تمام قرائن و آثار کے ساتھ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں استناد کے درجہ کو پہونچیں۔ بابری مسجد کے قریب واقع ہنومان گڑھی مندر کے سلسلہ میں ۱۸۵۵ کا ہندو مسلم تنازعہ بھی اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔

مقامی روایت کے مطابق مسلم فتوحات کے وقت اجودھیا کی حیثیت ویرانے سے بس کچھ ہی بہتر تھی ہندو عبادت گاہوں میں بہت معمولی تعداد میں پجاری موجود رہتے تھے انیسویں صدی کے وسط تک یہ رام کی پوجا کا ایک معروف مرکز بن گیا۔ اس انقلاب میں ایک اہم نکتہ یہ کارفرما تھا کہ اودھ کے نوابی دور میں مذہبی

رواداری کا عام چلن تھا۔ حالاں کہ نوابوں کے رواداری کے اس رجحان کے پیچھے کچھ سیاسی مصلحتیں کار فرما تھیں اٹھارویں صدی کے سیاسی انتشار وابتری کے دور میں اودھ نے مغلیہ سلطنت سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کی کوششوں میں سرگرداں تھا۔ اس کی بڑی آبادی ہندو رعایا پر مشتمل تھی۔ اس لیے نوابی نظام نے انتظامی اور جزلی انتظام میں ہندوؤں کے ساتھ اتحاد قائم کیا بالخصوص کائستھ اور راجپوت زمینداروں کے ساتھ۔

انیسویں صدی کے وسط سے اجودھیا میں ہندو سادھوؤں اور سنتوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا، اس اجتماع کا سب سے بڑا مرکز ہنومان گڑھی کا مندر تھا۔

۱۸۵۵ء میں اس مسئلہ کو لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باضابطہ مسلح تصادم ہوا۔ غیر متشدد اور آزاد خیال شیعہ حاکموں کے زمانے میں اجودھیا کا عروج ہندوؤں کی اہم عبادت گاہ کے طور پر ہوا اس نے قدامت پرست مسلمانوں کے بعض گروہ کو متنفر کر دیا اور اس طرح تنازعہ کا بیج بودیا گیا۔

۱۹۵۵ء کے ہنومان گڑھی کے ڈرامہ کو بعض لوگوں نے غلط انداز میں بابری مسجد، جنم استھان مسئلہ بنا دیا حیرت اس بات پر ہے

کہ مائیکل فشر نے ۱۸۵۵ء کے ہنومان گڑھی معاملے سے متعلق سرکاری دستاویزات کو کھنگال لینے کے باوجود جو ہزاروں صفحات پر مشتمل تھی ہنومان گڑھی مندر کو جنم استھان قرار دیدیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی بالارادہ یا غلط فہمی کی بنیاد پر اس غلط مبحث کو برقرار رکھا۔ کچھ لوگوں نے اس بنیاد پر یہاں تک کہا کہ ہندو بابری مسجد کو عرصے سے جنم استھان کہتے چلے آئے ہیں اس پر زور دینا کار عبث ہے کہ ۱۸۵۵ء کے واقعات کو غلط انداز میں لیا گیا وہ تنازعہ ہنومان گڑھی مندر کے سلسلے میں تھا نہ کہ بابری مسجد کے سلسلے میں۔ جنم استھان مندر کے سلسلہ کی مقامی روایات جن کا حوالہ برطانوی حکام دیتے ہیں ۱۸۵۵ء کے معاملے میں ان کا عمل دخل نہیں نظر نہیں آتا۔

ایک مقامی روایت جو ابھی ابھی ظاہر ہوئی ہے اور جسے قومی اعتقاد کا مسئلہ بنایا جا رہا ہے یہ کہا جانے لگا ہے کہ بابری مسجد کا رام جنم استھان ہونا ایمان و اعتقاد کا معاملہ ہے جس طرح عیسائی اس پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے تھے اور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے پیغمبر تھے بالکل اسی طرح یہ معاملہ بھی ہے کہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ رام وشنو کے اوتار تھے یہ تمام چیزیں مذہبی اعتقادات کی چیزیں

ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا مکہ میں ہونا یا رام کا اجودھیا میں، ویسا مسئلہ نہیں ہے یہ تاریخی حقائق سے متعلق معاملات ہیں جو اجودھیا کی معروف تاریخ کسی بھی زاویہ سے اس کی تصدیق نہیں کر پاتی کہ وہ واقعتاً رام کی جائے پیدائش ہے جیسا کہ دعویٰ کیا جا رہا ہے یا وہاں کبھی کوئی مندر موجود تھا جہاں اب بابری مسجد کھڑی ہے۔

کے این پنیکر (اناٹومی آف کنفرنٹیشن دی بابری مسجد رام جنم بھومی اشو)

بابری مسجد

چند تاریخی حقائق

سشیل سریواستو

"الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ کے استاد مسٹر سشیل سریواستو کئی برسوں سے فیض آباد کی تاریخ پر ریسرچ کر رہے ہیں، انھوں نے اس مقصد کے لیے بہت سی لائبریریوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ آثار قدیمہ اور فن تعمیر کے حوالے سے بھی ماضی میں دفن تاریخ کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے، ان کی اس ریسرچ کے دوران کچھ ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جو بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعے پر روشنی ڈالتے ہیں۔"

ایسا یقین ہے کہ رام جنم بھومی مندر وہیں پر واقع ہے جہاں بابری مسجد بنی ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس یقین کی بنیاد خاص طور پر مائیتھالوجی، لوک گیت اور لوک کہانیاں ہیں ایسا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ حقیقت میں مریادا پرشوتم بھگوان رام سے متعلق مندر اسی مقام پر واقع ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی ایسے کسی مندر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس یقین کی اصل بنیاد بالمیکی کی رامائن ہے اس کتاب میں اجودھیا شہر کو رام کی جائے پیدائش بتایا گیا ہے، اے کننگھم نے اپنی آرکیالوجیکل رپورٹ ۶۳-۱۸۶۲ میں اس سلسلے میں لکھا ہے:

رامائن کے مطابق اجودھیا شہر کو ساری نوع انسانی کے جد امجد "منو" نے بسایا تھا رام کے والد دشرتھ کے زمانے میں بجھویا اور دروازوں کے ساتھ اس کی قلعہ بندی کی گئی اور چاروں طرف کھائی کھود دی گئی اس تعمیر کے آثار اب معدوم ہو چکے ہیں اور اگر رام کی اجودھیا کا کوئی حصہ بچ بھی گیا ہوگا تو ایسا مانا جاتا ہے کہ ۱۴۲۶ قبل مسیح کی جنگ عظیم میں بر ہد بالا کی موت کے بعد تباہ کر دیا گیا ہوگا۔ اس کے بعد وکرمادتیہ کے وقت تک یہ شہر غیر آباد رہا جین سروتی کے مطابق یہ وکرمادتیہ ادجین کے مشہور شکاری راجکمار تھے لیکن آج کے ہندو سارے وکرمادتیوں کے

کارہائے نمایاں کو اسی ایک وکرمادتیہ سے جوڑتے ہیں لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، ہیونگ سانگ کی رائے ہے کہ اس نام (وکرمادتیہ) کا ایک طاقتور راجہ کمار پڑوس کے شراوستی نگر پر حکومت کرتا تھا یہ کنشک کے ٹھیک سو سال بعد یا ۱۷۸ء کے آس پاس کی بات ہے۔ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کنشک کا زمانہ ۲۷۸ء تھا اس لیے یہ زمانہ ۳۷۸ء کا ہونا چاہیے۔ یہ شالی واہن کے ذریعہ شروع کیے گئے شک سنبت کا ابتدائی سال تھا مذکورہ وکرمادتیہ کو بدھوں کے معاملے میں بہت ہی سخت مانا جاتا تھا وہ یقیناً بہت ہی پکے برہمن وادی رہے ہوں گے اس لیے میں مانتا ہوں کہ انھوں نے ہی اجودھیا کی نئے سرے سے تعمیر کی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ رام کی تاریخ سے متعلق تمام مقدس مقامات کو از سر نو بحال کیا ہوگا، کہاوت کے مطابق وکرمادتیہ جب اجودھیا پہونچے تو انھیں یہ شہر اجڑا اور جنگلوں سے ڈھکا ملا لیکن پرانے ریکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرجو کے لکشمن گھاٹ سے ناپ جوکھ کرکے وہ رام کی تاریخ سے جڑے مشہور مقامات کو کھوج نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے رام اور ان کی اہلیہ سیتا، بھائی لکشمن، بھرت اور شتروگھن اور بانر دیوتا ہنومان سے تعلق رکھنے والے مختلف مقدس مقامات پر نئی سو

مندر تعمیر کرائے۔

یوں تو بعض مصنفین اور سیاحوں کی تحریروں میں بھی اجودھیا کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی شری رام جنم بھومی مندر کا ذکر نہیں ملتا۔ مرات مسعودی میں اس مندر کا ذکر نہیں ہے ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں اور بابر نامہ میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ہاں ابوالفضل کی تحریر کردہ آئین اکبری میں یہ بات ضرور کہی گئی ہے کہ اجودھیا شہر کو رام جنم بھومی بھی کہا جاتا ہے چنانچہ یہ بات تو عام ہے کہ پوری اجودھیا رام جنم بھومی تھی اور اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ یہاں بہت سے مندر تھے لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یہاں شری رام جنم بھومی نام کا کوئی مندر تھا اور اسے توڑ کر مسجد کی تعمیر کی گئی ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ یہ یقین کیا کیسے اور کیوں عام ہوا کہ یہاں رام جنم بھومی مندر تھا جسے توڑ کر مسجد بنائی گئی، اسمیں کوئی شک کہ برطانوی دور اقتدار میں خرافیات کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی سب سے پہلے ۱۸۵۷ء کے بعد اس بات کا تذکرہ انگریز افسروں نے کیا کہ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو مغل حکمرانوں نے ناپاک کیا اس کی تائید محمد فیض بخش کی تصنیف تاریخ فرح بخش ۱۸۱۹ء تک کی فیض آباد کی تاریخ سے ہوتی ہے اس میں

۱۷۲۰ء اور ۱۸۱۹ء کے درمیان کے فیض آباد کے واقعات کی تفصیل ملتی ہے لیکن اسمیں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ بابری مسجد کی جگہ کوئی ہندو عبادت گاہ رہی ہے اور اس کے تعلق سے کوئی تنازعہ کبھی رہا ہے اسمیں اجودھیا کے واقعات کا ذکر ہے لیکن بابری مسجد رام جنم بھومی سے متعلق فرقہ وارانہ تنازعہ کا کوئی ذکر نہیں،

یہ سب تو ٹھیک ہے مسجد میں جن بارہ ستونوں کا استعمال ہوا ہے وہ غیر اسلامی ہیں سوال اٹھتا ہے کہ کیا مسجد کسی ہندو مندر کے کھنڈر پر بنائی گئی یا اسمیں کسی تباہ شدہ مندر کے ملبے کو استعمال کیا گیا کسی تحریری ثبوت کے نہ ہونے کے سبب اس سوال کا جواب دینا ممکن نہیں ہے۔

ایسا یقین ہے کہ وکرما دتیہ اجودھیا آئے تھے اور انھوں نے ۸۴ ستونوں پر شری رام جنم بھومی تعمیر کی تھی۔ الزام ہے کہ بابر نے اس مندر کو توڑ کر اس کے کھمبوں کو مسجد میں استعمال کیا۔ یہ ستون اب بھی اچھی حالت میں ہیں، یہ سیاہ رنگ کے ٹھوس ستون ہیں جس پتھر کے یہ ستون ہیں اسے مقامی لوگ کسوٹی پتھر کہتے ہیں یہ ستون تراشے ہوئے ہیں ان کی اونچائی سات سے آٹھ فٹ ہے ان کے نیچے کا اور اوپر کا حصہ چوکور ہے درمیانی حصہ گول یا ہشت پہلو ہے ایسے ہی دو کھمبے صوفی موسیٰ عاشقان کی قبر میں

نیم مدفون حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں (تاریخی ریکارڈ کے مطابق اس صوفی کا مقبرہ بنارس میں ہے لیکن خرافیات ظاہر ہے کہ کسی ایک فرقے کی میراث نہیں ہے) بابری مسجد میں لگے کھمبوں کی تصویر ہیں نہیں لینے دی گئی لیکن ایسے دو سے کھمبوں کی تصاویر ہم نے قدیم فن تعمیرات کے ماہرین کو دکھائیں' امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز، سینٹر آف آرٹ اینڈ آرکیالوجی رام نگر وارانسی کے ہرش نبسر ایم اے ڈھاکے اور ڈاکٹر کرشن دیو کا خیال ہے کہ یہ ستون نویں اور گیارہویں صدی کے درمیان کے کسی زمانے کے ہیں' اگر بابری مسجد میں لگے ستون اسی زمانے کے ہیں جیسا کہ اوپر سے دیکھنے میں بالکل ویسے ہی لگتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وکرما دتیہ کے تعمیر کردہ کسی مندر یا عمارت کے ستون یہ قطعی نہیں ہو سکتے اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ رام کی جائے پیدائش پر وکرما دتیہ نے مندر بنوایا تھا تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کھمبے اس مندر کے قطعاً نہیں ہو سکتے۔ اگر رام کے وجود کو ایک تاریخی حقیقت مان لیا جائے تو سوال اٹھتا ہے کہ اگر بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر نہیں تھا تو پھر رام کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

اس سلسلے میں "ایودھیا مہاتمیا" (یاتریوں کے لیے گائیڈ) نامی تصنیف ہماری مدد کرتی ہے۔ مہاتمیا سنسکرت میں ہے لیکن

جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" (جلد ۴۵ جز ایک نمبر ۱ تا ۴ ۱۸۷۵ء کلکتہ ۱۸۷۵ء) میں اس کا ترجمہ چھپا ہے یہ ترجمہ رام نارائن نے کیا ہے، اجودھیا کے مہاراجہ مان سنگھ کا دعویٰ ہے کہ اجودھیا مہاتمیا سوریہ ونش کے اکشواکو کی تصنیف ہے۔ اس کے برعکس۔ اجودھیا کے پنڈت اودھ دتیہ کی رائے زیادہ صائب اور قابل یقین ہے کیوں کہ مہاتمیا لکھنے کی روایت سولہویں صدی میں مقبول ہوئی ہے۔ پہلا مہاتمیا "گنگا مہاتمیا" تھا جو سولہویں صدی کی چوتھی یا پانچویں دہائی میں لکھا گیا تھا ایسا لگتا ہے کہ اجودھیا مہاتمیا بعد میں لکھا گیا۔ اس میں دو بار پریاگ کو الہ آباد کہا گیا ہے۔ اکبر (سولہویں صدی) نے پریاگ کو "الہ باس" کا نام دیا تھا اور شاہجہاں (سترہویں صدی) نے اسے الہ آباد کا نام دیا، اس لیے یہ ممکن ہے کہ اجودھیا مہاتمیا یا تو شاہجہاں کے دور میں یا اس کے بعد لکھا گیا۔ اس مہاتمیا میں لکھا ہے: "سورگ دوار (اجودھیا میں) داخل ہونے سے ہزاروں جنموں کے پاپ دھل جاتے ہیں، یہاں مرنے کبھی لوگ ہندو اور مسلمان چرند و پرند کیڑے اور مکوڑے وشنو دھام پہونچتے ہیں، وشنو چترنبھی (چار بازوؤں والے) ہیں ان کی کمال جیسی آنکھیں ہیں، وہ شنکھ، چکر، گدا اور پدما دھاری ہیں اور گروڑ کی سواری کرتے ہیں" اس طرح اس بات

پر شک کرنے کی معقول بنیاد ہے کہ یہ اچھاوک کی تصنیف ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ مہاتمیا اکبر کے دور میں یا اس کے بعد وجود میں آیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اجودھیا کی اہمیت تلسی داس کی تصنیف "رام چرت مانس" کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ بڑی ہے۔

اجودھیا مہاتمیا میں رام کی جائے پیدائش کا دوبار ذکر آیا ہے اس میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ راجا دشرتھ کے چاروں بیٹے اپنی ماں کے محل میں پیدا ہوئے تھے، ایک جگہ کہا گیا ہے کہ سیتا رسوئی جائے پیدائش یعنی کوشلیا بھون کے شمال مغرب میں واقع ہے جائے پیدائش (جنم استھل) سے چالیس گز اُتر کی جانب "کیکئی بھون" کے نام سے جانا جاتا تھا کیونکہ کیکئی نے اسے سیتا کو منہ دکھائی میں دیدیا تھا۔ جنم بھومی سے ساٹھ گز جنوب میں سمترا کا محل ہے جہاں لکشمن اور شتروگھن پیدا ہوئے تھے۔ جنم استھل کے جنوب مشرق میں سیتا کوپ ہے جسے "گیان کوپ" بھی کہا جاتا ہے (اجودھیا مہاتمیا باب ۱۰) دوسری جگہ اس میں کہا گیا ہے "جنم بھومی (رام کی جائے پیدائش) میں جانا چاہیئے۔ وگھنیشور کے مشرق یا وششٹھ کی رہائش گاہ کے شمال میں یا لوماسا رشی کی کٹیا کے مغرب میں یہ جائے پیدائش واقع ہے جسے صرف دیکھ لینے سے ہی انسان کی جونی سے نجات مل جاتی ہے"۔

(اجودھیا مہاتمیا باب ۱۰)

لیکن آج جو جنم استھان ہے کیا وہ اجودھیا مہاتمیا کی بتائی جگہ ہے؟ مہاتمیا کے مطابق مندر کے شمال مغرب میں "سیتا رسوئی" ہونی چاہیئے جس سے کوشلیا بھون کے جائے وقوع کا بھی پتہ چلنا چاہیئے جہاں رام کا جنم ہوا تھا۔ لیکن آج جہاں سیتا رسوئی بتائی جاتی ہے وہ بابری مسجد (جسے رام کا جنم استھان کہا جارہا ہے) سے ۲۰، ۲۵ گز شمال مشرق میں ہے اسی طرح دشرتھ کی تین رانیوں کے محل بھی سیدھے شمال سے جنوب کی جانب ہیں کیکئی بھون کے بالکل شمال میں ہے، مہاتمیا کے مطابق جنم استھان کیکئی بھون سے چالیس گز جنوب کی جانب ہونا چاہیئے لیکن آج جہاں جنم استھان مانا جاتا ہے وہ مقام (بابری مسجد) کیکئی بھون سے جنوب مغرب میں ہے، اسی طرح مہاتمیا کے مطابق سمترا کا محل بھی جنم استھان سے جنوب کی سمت میں ۶۰ گز کی دوری پر ہونا چاہیئے لیکن آج جہاں سمترا بھون بتایا جاتا ہے وہ جگہ بابری مسجد کے جنوب میں ہے، اسی طرح بگھنیشور، یوما سارسٹی اور سشٹھ کی استھ گاہوں سے جنم استھان کا پتہ لگائیں تو پائیں گے کہ مسجد کی صورتحال کے مطابق بگھنیشور کے استھان سے سیدھے مشرق میں ہونے کے بجائے شمال مشرق میں ہے یوما سارسٹی کنڈ سے

مغرب کے بجائے شمال مغرب میں ہے اور وششٹھ کے آشرم سے شمال کے بجائے شمال مغرب میں ہے حقیقت میں دیکھا جائے تو مہاتمیا کے حساب سے مسجد کے آس پاس کہیں سیتا کوپ رہا ہوگا کیونکہ سیتا کوپ مسجد کے سیدھے جنوب مشرق میں ہے لیکن چونکہ مہاتمیا میں کچھ مقامات کی متعین دوری نہیں دی گئی ہے اور دوسرے حوالوں میں بھی تضاد پایا جاتا ہے ایسی حالت میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسجد ٹھیک جنم استھان پر واقع ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں اور کوئی چیز نہیں رہی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ یہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہاں اور کوئی ہندو دھرم استھان رہا ہوگا؟ اور اگر وہاں ہندو دھرم استھل نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

بابری مسجد

یہ خیال ۱۹ ویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوا کہ بھگوان رام کے جنم استھل پر بنے مندر کو توڑ کر بابری مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس خیال کی جڑیں انگریزوں کی اس حکمت عملی میں پوشیدہ ہیں جس کے تحت وہ فرقہ وارانہ ٹکراؤ کو ہوا دے کر اس خطے میں امن و قانون کے مسائل پیدا کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ اودھ کے ہڑپنے کو ضروری اور اخلاقی بنیاد پر درست ٹھہرا سکیں۔ (دیکھیے منسلک کہانی)

عوام کے ذہن میں فرقہ وارئیت کا زہر گھولنے کیلئے انگریزوں نے اس خیال کو عام کیا کہ مغلوں نے اجودھیا میں ہندوؤں کے مقدس مقامات کو ناپاک کیا اس کے پیچھے چال یہ تھی کہ وہ اپنے کو اکثریتی فرقہ یعنی ہندوؤں کا نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ مغل انگریزوں کے پیش رو تھے اس لیے مغلوں کو قربانی کا بکرہ بنانا ان کے لیے آسان تھا۔ نتیجہ کے طور پر انھوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ اس بات کو ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ مغلوں نے ہندوؤں پر ظلم کیا وہ ہندوؤں کی تہذیب و ثقافت اور ان کی روایات کے دشمن تھے۔

انگریزوں نے اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے جان لیڈن کو اپنی بیساکھی بنایا ۱۸۱۳ء میں لیڈن کی تصنیف "میموائرز آف ظہیرالدین محمد بابر، امپرر آف ہندوستان" (بابر کی یادداشتوں کا ترجمہ) شائع ہوئی تھی۔ لیڈن نے اس میں لکھا تھا کہ پٹھانوں کے خلاف معرکے کے دوران بابر مارچ ۱۵۲۸ء میں اجودھیا سے گزرا تھا حالانکہ لیڈن نے اگرچہ اس ترجمے میں یہ بات کہیں نہیں کہی کہ بابر نے اجودھیا میں ہندو مندر توڑے تھے لیکن انگریز حکمرانوں نے اس پروپیگنڈہ کو ثابت کرنے کے لیے کہ اجودھیا سے گزرتے وقت بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑا تھا۔ لیڈن کو استعمال کیا۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ انگریزوں کے اس پروپیگنڈہ پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی اور آج بھی صورتحال کچھ اسی طرح ہے کسی نے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس علاقے میں مسلمانوں کا اثر ۱۰۳۰ء کے آس پاس جم چکا تھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ بابر سے پہلے کسی مسلم حکمراں میں مذہبی جنون پیدا نہیں ہوا کہ وہ اجودھیا میں بنے پرائے دھرم کے مندروں کو تباہ کرتا۔ خاص کر اس اہم مندر کو جو رام کے جنم استھان پر بنا تھا جب کہ ایسے تاریخی شواہد ہیں کہ مسلم (ترکی) حکمرانوں نے ہندو مندر توڑ کر مسجدیں بنائی ہیں، دہلی میں قطب کمپلکس، اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا اس کی مثال ہیں جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے تاریخ گواہ ہے کہ اودھ میں ۱۰۳۰ھ سے مسلمانوں کا اثر بڑھنا شروع ہو گیا تھا مرات مسعودی (سید سالار مسعود کی مہم کی تفصیل) کے مطابق سید سالار مسعود ۱۰۳۰ء میں ملتان سے اودھ پہونچے تھے اودھ پر فتح حاصل کرنے میں انھیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور کچھ دنوں تک وہ وہاں مقیم رہے ۱۰۸۰ء میں سلطان ابراہیم کے دور حکومت میں ترکی فوجوں نے نئے سرے سے اودھ کی طرف کوچ کیا۔ اس مہم کی کمان حاجب تگاتگن کے ہاتھوں میں تھی اس مہم کے تحت ترکی فوجیں گنگا کو پار کر کے ہندوستان میں آگے تک

بڑھی تھیں سید سالار مسعود کے زمانے تک کوئی حملہ آور اتنی دور تک پہونچا تھا۔ شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور معیز الدین محمد بن سام نے ۱۱۹۴ء میں قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد اودھ کو فتح کرلیا تھا۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ یا تو اس نے خود یا اس کے کسی سپہ سالار نے اجودھیا پر قبضہ کیا تھا۔

۱۱۹۴ء تک مسلمانوں کی پہونچ اجودھیا تک ہو چکی تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۵۲۸ء میں جاکر انھیں احساس ہوا کہ رام جنم بھومی مندر توڑے بغیر ہندو دھرم کو ذلیل نہیں کیا جاسکتا۔

اتنا ہی نہیں، یہ بات بھی بے بنیاد ہے کہ بابر اور اورنگ زیب نے اجودھیا کے ہندو مندروں کو نیست و نابود کیا تھا کیوں کہ نہ تو کبھی بابر اور نہ کبھی اورنگ زیب اجودھیا گیا۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ بابر پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ اس نے شری رام جنم بھومی مندر کو توڑا تھا، بابر نامہ اس بات کا گواہ ہے کہ بابر پکا مسلمان تو تھا لیکن دوسرے مذاہب کے لیے بابر کے دل میں کسی قسم کی نفرت نہیں تھی۔

۱۹۲۱ء میں اے ایس بیورج کی میموئرس آف بابر (بابر نامہ کا ترجمہ) میں کہا گیا ہے کہ اپنی مہم کے دوران بابر ہندو مندروں میں گیا اور ان کے فن تعمیر کو سراہا میموئرس میں ایسا کوئی ذکر نہیں ہے کہ

بابر مندروں کو تباہ کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ بابر نے اجودھیا میں کسی ہندو مندر کو توڑا۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بابر کبھی اجودھیا گیا

صرف لیڈن کی تصنیف نے اس خیال کو جنم دیا ہے کہ شری رام جنم بھومی مندر کو بابر نے برباد کیا تھا۔ بابر سے متعلق لیڈن کی تصنیف میں یہ لکھا ہے کہ ۲۸ مارچ ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا گیا تھا اس خیال کو اس وجہ سے تقویت حاصل ہوئی کہ اصلی بابر نامہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود نسخہ کے وہ صفحات غائب ہیں جن میں بابر کی ۲ اپریل سے ۸ ستمبر ۱۹۲۸ء تک کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ لیڈن نے اس لیے یہ نتیجہ نکال لیا کہ بابر اس مدت کے دوران اجودھیا میں تھا۔ لیکن کیا واقعی بابر اس وقت اجودھیا میں تھا؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیڈن اس علاقے کے جغرافیہ سے بالکل ہی ناواقف تھا۔ بابر نے جس مقام پر پڑاؤ کیا تھا لیڈن نے اس مقام کی غلط معلومات فراہم کی ہے بابر کے مطابق (جیسا کہ لیڈن نے بتایا ہے) یہ مقام اودھ (اجودھیا) سے چار سے چھ میل شمال میں تھا۔ بابر صحیح معلومات رکھنے والا شخص تھا اس لیے اس کے حوالوں میں غلطی کا امکان کم ہے۔ وہ لکھتا ہے: "سنیچر، رجب (۲۸ مارچ ۱۵۲۸ء) کے دن ہم نے اودھ کے اوپر گھاگھر (گھاگھرا) اور سرو

(سروا) کے سنگم سے دو تین کوس پر پڑاؤ ڈالا (میموئرس آف ظہیرالدین محمد بن بابر) اس سے لیڈن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بابر نے سروا اور گھاگھرا کے سنگم پر پڑاؤ ڈالا۔ اس نے گھاگھرا کے سروا گھاٹ کو سروا اور گھاگھرا کا سنگم سمجھ لیا۔ (دیکھیے نقشہ) یہ حصہ اجودھیا کے جنوب میں سولہ میل کی دوری پر ہے، لیکن لیڈن نے پکا یقین کر لیا کہ بابر نے اجودھیا کے بہت قریب پڑاؤ ڈالا تھا۔ اسی طرح کے جغرافیائی تضادات دوسرے انگریز مورخین کی تصانیف میں بھی ملتے ہیں۔ ولیم ارسکن نے "ہسٹری آف انڈیا انڈر دی ٹو فرسٹ ساورنس آف دی ہاؤس آف تیمور، بابر اینڈ ہمایوں"۔ (دو جلدیں لندن ۱۸۵۴ء) اور ایچ ایم ایلیٹ نے "ہسٹری آف انڈیا، ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریئنس" جلد ۴ ۱۸۷۲ء) نے لیڈن کی طرح ہی لکھا ہے کہ بابر نے گھاگھرا اور سروا کے سنگم سے ۵۔۴ میل اوپر کی طرف پڑاؤ ڈالا تھا۔ اسی غلطی کو لیڈی اینیٹ ایس بیوریج نے "بابر نامہ میموئرس آف بابر ۱۹۲۲ء" میں درست کیا لیڈی اینیٹ نے نتیجہ نکالا کہ بابر نے سارو اور گھاگھرا ندی کے سنگم سے شمال کی طرف چار پانچ میل کی دوری پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس نے بابر کے ترجمہ کا کام فیض آباد میں کچھ دنوں تک قیام کرنے کے بعد ہاتھ میں لیا تھا۔ جب کہ لیڈن نے ایسا نہیں کیا تھا۔

لیڈی اینیبٹ کا خیال ہے کہ کالی شاردا۔ جو کا نوی ہی شاردا ہے جو گھاگھرا کی معاون ندی ہے، اس خیال کو صحیح ماننے کے تین اسباب ہیں (۱) جہاں گھاگھرا اجودھیا کو چھوتی ہوئی بہتی ہے وہاں اس کو سرجو کے نام سے جانا جاتا ہے بہرائچ کے پاس سرجو گھاگھرا میں ملتی ہے۔

(۲) بابر نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ شاردا ندی چھچھلی ہے اور اسکو پیدل پار کیا جاسکتا ہے۔

(۳) اکثر تاریخ لکھنے والوں نے اودھ اور اجودھیا کو ایک ہی مانا ہے انھوں نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ سبھی مسلمان تاریخ لکھنے والوں نے گومتی اور گھاگھرا کے درمیانی علاقے کو اودھ کہا ہے، اس طرح بہرائچ میں دونوں ندیوں کا سنگم بھی اودھ ہی کہا تا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تضاد بیانی کا سبب رسم الخط ہے ندی کے نام میں آئے اردو کے حرف دال' کو غلطی سے داؤ سمجھ لیا گیا ہے ویسے دونوں ندیوں کا سنگم بارہ بنکی کے شمال میں پڑتا ہے جو اجودھیا سے ۷۲ میل شمال میں ہے ظاہر ہے کہ بابر مارچ ۱۵۲۸ء میں کے پاس نہیں تھا۔ چوں کہ اصلی بابر نامہ کے وہ صفحات غائب ہیں جن میں ۲ اپریل سے ۸ ستمبر ۱۵۲۸ء تک بابر کی سرگرمیاں

تحریر تھیں اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بابر کبھی اجودھیا گیا تھا ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر بابر نے شری رام جنم بھومی کو خود توڑا ہوتا یا توڑنے کا فرمان جاری کیا ہوتا تو یہ بات بابر نامہ میں ضرور تحریر ہوتی اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انگریز حکمرانوں نے لیڈن کی بات صحیح مان کر یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ بابر اجودھیا گیا تھا اور مندر توڑ کر مسجد بنوا دی تھی۔

منطقی طور پر دیکھیں تو یہ بات نہیں جمتی کہ بابر جب پٹھانوں سے برسر جنگ تھا تو ایک مندر کو توڑنے کے لیے اس نے وقت نکالا ہو، کیوں کہ اس سے وہ اکثریت کی ہمدردیوں سے محروم ہو جاتا اپنے آپ کو کمزور بناتا۔ لیکن سبھی انگریز مورخوں نے یہ لکھا ہے کہ بابر ۱۵۲۸ء میں اجودھیا گیا تھا اور وہاں ایک ہفتہ کے لیے رکا تھا اور اس نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر اپنے نام پر مسجد بنوائی تھی ان مورخوں میں پی کارنیگی (اے ہسٹوریکل اسکیچ آف فیض آباد تحصیل، انکلیوڈنگ دی فارمر کیپٹلس آف اجودھیا اینڈ فیض آباد الہ آباد ۱۸۶۱ء) ڈبلیو سی بینیٹ وگر یٹیر آف دی پراونس آف اودھ، ۳ جلدیں کلکتہ ۱۸۷۷ء اے فیوہرر (رپورٹ آف دی آرکائیو جیکل سروے آف انڈیا (امپیریل سیریز) دی مانومنٹل انٹیکوٹیز اینڈ انسکرپشنس ان دی نارتھ ویسٹرن پراونسز

اینڈ اودھ ۲ جلدیں ۱۹۰۱ء) اور ایچ آر نیول (ڈسٹرکٹ گزیٹیرس آف دی یونائیٹڈ پراونسز آف آگرہ اینڈ اودھ فیض آباد جلد ۶۳ الہ آباد ۱۹۰۵ء وغیرہ شامل ہیں۔

ان انگریز مورخوں کے برخلاف اے کنگھم نے اس بات کو مانا ہے کہ مسلمانوں کے ذریعے اجودھیا میں پرانے مندروں کو تباہ کیا گیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ خود بابر نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تھا یہ بات کنگھم نے رپورٹ آف دی آرکائیالوجیکل سروے آف انڈیا جلد ۱ ۱۸۶۲ء میں کہی ہے اس بات کی ابھی تک کسی نے تردید نہیں کی ہے کنگھم کہتا ہے کہ " اجودھیا میں متعدد مقدس مندر ہیں لیکن وہ سبھی موجودہ دور کے ہیں اور ان کا فن تعمیر کوئی خاص قابل ذکر نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مندر ان قدیم مندروں کی جگہ پر تعمیر کیے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے تہس نہس کر دیا تھا۔ شہر کے مشرق میں، رام کوٹ، یا ہنومان گڑھی ہے جو چھوٹی دیواروں کا ایک قلعہ ہے وہ ایک پرانے ٹیلے پر جدید تعمیر کیے گئے مندر کو گھیرے ہوئے ہے ' یقیناً رام کوٹ ' قدیم نام ہے کیوں کہ یہ معنی بہت کی روایات سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ ہنومان مندر اورنگ زیب کے دور سے پہلے کا نہیں ہے اس کے باوجود یہ تنازعہ جاری ہے کہ رام جنم بھومی مندر توڑ کر

بابری مسجد بنائی گئی، اس تنازعہ کا سبب مسجد پر لکھی عبارتیں اور غیر اسلامی کھمبے ہیں، عبارتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد ۱۵۲۹ء میں بنائی گئی۔ لیڈی اے ایس بیورج کا خیال ہے کہ مسجد بابر کے فرمان سے بنی۔ دراصل کندہ عبارت میں ہے کہ مسجد امیر میر باقی نے بنوائی تھی جو بابر کے دربار میں ایک امیر تھا اور جسے بابر نے اودھ (اجودھیا) میں اپنے قیام کے دوران ۱۵۳۲ء میں دیا۔ اس وقت وہ ہندو مندر کی عظمت اور تقدس سے متاثر ہوا ہوگا، اس نے مندر کو توڑا (ایک حصہ) محمدؐ کے پیرو کی حیثیت سے اس کے لیے بھی دوسرے مذاہب ناقابل برداشت تھے اور اس نے مندر کی جگہ مسجد بنوانا اپنا فرض سمجھا۔ مسجد ۹۳۵ھ میں بن کر تیار ہوئی لیکن بابر نامہ میں اس کے مکمل ہونے کا کوئی ذکر نہیں ۹۳۵ھ کی ڈائری میں کئی خامیاں ہیں، ایک تو ۹۳۴ھ (بابر نامہ کا اس وقت کے جز) کی بہت سی چیزیں غائب ہو گئی ہیں خاص کر جہاں اودھ کا ذکر شروع ہونا تھا اس سے پہلے کی۔" (اے ایس بیورج کا بابر نامہ ۱۹۲۲ء صفحہ ۷۷) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیڈی بیورج مقامی طور پر مروج خیالات سے متاثر ہوئی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو بابر نامہ اور نہ ہی مسجد کی عبارتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ شری رام جنم بھومی مندر کو خود

بابر۔ یا اس کے کسی آدمی نے مسمار کر کے مسجد تعمیر کی ہے اگرچہ عبارتوں کو دیکھنے پر بھی کئی طرح سے شک وشبہ ہوتا ہے یہاں تین عبارتیں ہیں دو بابری مسجد کے باہر اور ایک۔ اندر منبر کے اوپر۔ باہر کی عبارتوں میں سے ایک چھ سطروں پر مشتمل ہے اور دوسری ایک سطر پر۔ یہ عبارتیں شعر کی طرح ہیں چھ سطروں والی عبارت کی پہلی سطر میں تحریر ہے "بہ فرمودہ شاہ بابر کہ عادلش" بیورج نے اپنے ترجمہ "بہ فرمودۂ شاہ بابر کا مطلب شہنشاہ بابر کا حکم لیا ہے لیکن ڈی بیورج کا یہ مطلب غلط ہے، یہ بات قابل غور ہے کہ فاتحوں کے قبضہ میں ساری زمین حکمراں کی مانی جاتی تھی ایسی حالت میں عمارت کوئی بھی تعمیر کرائے اس کے ساتھ اس وقت کے بادشاہ کا نام منسلک ہونا خلاف معمول بات نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے میر باقی نے شہنشاہ بابر کو خوش کرنے کے لیے اجودھیا کی مسجد کو بابر کی نذر کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا کیوں کہ دستیاب دستاویزات میں کسی ایسے شاہی فرمان کا وجود نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ بابر نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تھا دوسری مسجدوں میں تعمیر کے وقت ایسا ہوا ہے دہلی کے پرانے قلعہ کے پاس ہی بابری مسجد کی تعمیر کے لیے فرمان ریکارڈ میں دستیاب ہے اس کے علاوہ بھی مسجد کے باہر کی عبارتوں کے رسم الخط اور الفاظ سے بھی متعدد شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ فارسی

داں اور مشہور اردو تنقید نگار شمس الرحمان فاروقی کا خیال ہے کہ اگر بابر کا واضح فرمان رہا ہوتا تو اس کے (بابری عبارت) الفاظ کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی "بحکم ظہیر الدین غازی بابر" نہ کہ بہ فرمودۂ شاہ بابر" جس کا مطلب ہوتا ہے شہنشاہ بابر کی خواہش سے" مذکورہ عالم کا خیال ہے کہ یہ تحریر ۱۹ ویں صدی کی ہے جب کہ پہلے کے رسم الخط میں نفیس سطریں ہوتی تھیں اور اس تحریر میں موٹی سطریں ہی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بعد کی تحریر ہے وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ عبارتیں کسی ایسے شخص نے لکھوائی ہیں جو فارسی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ اس طرح سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ عبارتیں مندر مسجد تنازعہ کے پیدا ہونے کے بعد کسی نے ۱۹ ویں صدی میں لکھوائی تھیں وہ شخص غالباً یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہ مسجد بابر کے حکم سے بنی ہے۔

لیکن بابر کا نام ہی کیوں اچھالا۔ صاف ہے کہ اس کے پیچھے اس یقین کو مصدق کرنا تھا جس کے تحت یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ۱۵ مارچ ۱۵۲۹ء کو بابر نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی یہ نتیجہ مسجد کے اندر واقع منبر کے اوپر کی تین لائنوں پر نظر دوڑانے پر قرین عقل معلوم ہوتا ہے پہلی سطر میں خدا کی تعریف، دوسری سطر میں پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ہے جب کہ تیسری سطر میں

ایک طاقت ور شہنشاہ بابر کی عظمت کا اعتراف ہے ان سطروں میں کہیں بھی بابر کے حکم کا ذکر نہیں ہے اس کے علاوہ دوسری دو عبارتوں میں بھی اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر یا دوسرا کوئی ہندو مندر تھا۔

مسجد کا فن تعمیر بھی کافی دلچسپ ہے، اس مسجد کی تعمیر شرقی فن تعمیر کے تحت عمل میں آئی ہے جونپور کے شرقی سلطان اپنی عمارتوں کی تعمیر کے لیے ہندوستانی راج گیروں کو استعمال کرتے تھے اس لیے وہ ایسے محراب بنانے میں ناکام رہے جنھیں خامیوں سے پاک کہا جا سکتا ہے زیادہ تر شرقی یادگاروں کے محراب خاص طریقے کے بنے ہوئے ہیں اور نیچے پڑ چکے ہیں، علاوہ ازیں اس مسجد کو پیچھے سے (مغرب کی سمت سے) دیکھا جائے تو وہ جونپور کی اٹالہ مسجد سے میل کھاتی ہے، اس ضمن میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پندرہویں صدی تک دہلی میں ترکوں نے گنبد بنانے کے اپنے طرز کو ترقی دے لی تھی اور انھوں نے محراب کی تعمیر میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی، لیکن اس کی کوئی جھلک بابری مسجد میں نہیں ملتی اگر مسجد سولھویں صدی میں بنی ہوتی یعنی بابر کے دور میں اس کی تعمیر عمل میں آئی ہوتی تو اس میں اس وقت تک فن تعمیر میں جو مہارتیں حاصل کی گئی تھیں ان کی جھلک ضرور دکھائی پڑتی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بابری مسجد کے شمالی دروازے پر ایک خاص نشان ثبت ہے، دروازے کے اوپر آمنے سامنے دو باگھ ہیں یہ چھلانگ لگانے کی پوزیشن میں ہیں اور ان کی دم بل کھائی ہوئی ہے ان دو باگھوں کے درمیان ایک سیدھا مور ہے ٹھیک اسی طرح کے باگھ شرقی راجاؤں کے سکوں پر بنے ہوئے ہیں تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ۱۳۷۶ء میں اودھ کی ریاست ملک حسام الملک اور حسام الدین ناوا کے زیر نگیں تھا، اس کے کافی دنوں بعد فیروز شاہ تغلق کی موت کے بعد پیدا ہونے والے عدم استحکام کے دوران افغان سرداروں نے آزاد ریاستیں قائم کرنے کی کوشش شروع کی تھیں۔ ۱۳۹۲ء کے آس پاس وزیر خواجہ جہاں نے اودھ اور بہار اور قنوج کے بیچ پڑنے والے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا جسے جونپور کی شاہی ریاست کی شکل دی گئی دہلی کے خانہ جنگی کے دوران اس نے اپنی پوزیشن اور مضبوط کی اور ایک آزاد سلطنت قائم کر لی، بہت ممکن ہے کہ آج جسے بابری مسجد کہا جاتا ہے اس کی تعمیر اسی کے آس پاس یعنی چودھویں صدی میں ہوئی ہوگی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ بابر جیسا خوش ذوق ایسی کسی مسجد کے لیے متفق ہو گیا جس میں نہ تو کوئی کشش تھی اور نہ فن تعمیر کے اعتبار سے جسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے۔ اس

تنازعے کو اچھالنے والے لوگوں سے محسوس یہ ہوتا ہے اس بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مان لیا کہ مندر کی جگہ پر مسجد بنی ہوئی ہے، انگریز مصنفین کی دلیل ہے کہ اجودھیا میں ہندو مندروں کو ناپاک کرنے کے پیچھے ہندوستان میں اسلام کی توسیع کا منصوبہ تھا لیکن یہ دلیل بالکل بچر ہے، کیونکہ کسی متنازعہ زمین پر نماز پڑھنے کی بات شرعی رو سے درست نہیں ہے ظاہر ہے کہ اگر مندر کی جگہ مسجد بنی ہوتی تو مسجد بنانا بے معنی ہوتا کیونکہ اس میں نماز تو پڑھی نہیں جا سکتی یہ کہنا چاہوں گا کہ وارانسی اور متھرا میں بنی متنازعہ مسجدیں بھی ٹھیک اس جگہ پر نہیں بنی ہو سکتیں جہاں پہلے مندر تھے۔ توڑے گئے مندر کے قریب تو مسجد بنائی جا سکتی ہے لیکن ٹھیک اسی جگہ پر مسجد بنانا ناممکن ہے یہ مذہبی اصولوں کے خلاف ہے اس طرح کی صورت حال میں کیا یہ ممکن ہے کہ بابر جیسا پکا مسلمان اور قرآن پر نظر رکھنے والا ایسی غلطی کر سکتا تھا کہ وہ اپنے نام پر اس جگہ مسجد بناتا جس جگہ ایک ہندو مندر تھا سوال اٹھتا ہے کہ پھر وہاں کیا تھا؟

بدھ یادگار

۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیان کننگھم نے شمالی ہندوستان کے قدیم آثار کی چھان بین کی۔ ان کا بنیادی مقصد ان مقامات

کی نشاندہی تھی۔ جہاں جہاں چینی سیاح فاہیان اور ہیونگ سانگ پہونچے تھے۔ فاہیان سنہ ۴۰۰ء اور سنہ ۴۱۴ء کے بیچ ہندوستان آیا تھا، جب کہ ہیونگ سانگ سنہ ۶۹۳ء میں ہندوستان پہونچا تھا کننگھم اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ "شاچی" نامی مقام جس کا ذکر فاہیان نے کیا ہے اور "وشاکھا" نامی مقام جس کا تذکرہ ہیونگ سانگ نے کیا ہے دراصل ایک ہی مقام ہے اور جس جغرافیائی اکائی کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے وہ کوئی اور نہیں اجودھیا ہی ہوسکتی ہے۔

کننگھم کے مطابق "شاچی" کے بارے میں فاہیان نے کہا ہے "اس شہر کے دروازے سے باہر نکل کر سڑک کے مشرقی جانب وہ مقام ہے جہاں مہاتما بدھ نے اپنی مسواک کا ایک ٹکڑا پھینک دیا تھا اور جس کے بعد اس نے بتدریج سات فٹ اونچے پیڑ کی شکل اختیار کرلی۔ وہ نہ کبھی گھٹی اور نہ کبھی بڑھی۔" اس کا تذکرہ ہیونگ سانگ نے بھی "وشاکھا" کے تعلق سے کیا ہے وہ کہتا ہے

"شہر کے جنوب
کے پورب کی جا
چیزوں کے علا

اور سڑکوں کے بائیں جانب (یعنی سڑک
ان نے کہا ہے) دوسری متبرک
ستہ فٹ کا پیڑ بھی تھا جو نہ گھٹ

گھٹتا تھا نہ کبھی بڑھتا تھا"۔ تہاتما بدھ کی مسواک کے پیڑ کے بارے میں ایک اور ثبوت بھی ہے اس پیڑ کے سلسلے میں فاہیان اور ہیونگ سانگ نے ایک ہی جیسی باتیں کہی ہیں، اس سے میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ دونوں چینی سیاح ایک ہی شہر کا تذکرہ کر رہے تھے اگرچہ ایک نے اسے "شاچی" اور دوسرے نے "وشاکھا" کا نام دیا۔

وشاکھا ہی ساکیت یا اجودھیا ہے اس کی تصدیق کے لیے میں نے مندرجہ ذیل حقائق کا سہارا لیا ہے جو اس طرح ہیں۔

(۱) بودھ تاریخ میں "وشاکھا" ان مشہور عورتوں میں سے ایک رہی ہیں جو ساکیت باشندہ تھیں، اس کی شادی شراوستی کے دولت مند تاجر مرگیگا رکے لڑکے پورن وردھن سے ہوئی تھی

(۲) ہیونگ سانگ کے مطابق وہ ساکیت میں سولہ سال رہے قدیم ہندوستان کے مشہور جغرافیہ داں پروفیسر بی سی لا نے بھی کننگھم کی رائے سے اتفاق کیا ہے، اپنی کتاب (انڈولاجیکل اسٹڈیز حصہ ۳ باب ۲ الہ آباد ۱۹۹۴ء میں انھوں نے کہا ہے:

"ایودھیا اجو جھایا اجودھیا ہندوؤں کے سات مقدس مقامات میں سے ایک ہے۔ فاہیان نے اس شہر کو "شاچی" کہا ہے بطلیموس کے مطابق یہ سوگڈا کے نام سے جانا جاتا ہے یہ شہر

سرجو ندی کے کنارے واقع ہے یہ وشنو دھرم کے ماننے والوں کے لیے بھی ایک مقدس مقام ہے پالی ساہتیہ میں مذکورہ سرجو یا سرجو اودھ کی گھاگھرا یا گوگرا ہی ہے"

کننگھم اپنے اس یقین پر قائم رہا کہ گوتم بدھ نے ساکیت (اجودھیا) میں قیام کیا تھا، بودھ سے متعلق سیلون (سری لنکا) و برما کی تاریخ کے مطابق گیان حاصل کرنے کے وقت گوتم بدھ ۳۵ برس کے تھے اس کے فوراً بعد بیس برس تک انھوں نے سنیاس کی زندگی بسر کی اور شمالی ہندوستان میں جگہ جگہ گھوم کر مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان مقامات کا ذکر مندرجہ بالا تاریخ میں آتا ہے اسی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کننگھم کہتا ہے (آرکیولاجیکل رپورٹ صفحہ ۳۱۹):

"بیس سال تک مذہب کی تبلیغ کرنے کے بعد بقیہ پچیس برس انھوں نے بدھ مٹھوں میں گزارے ۹ برس سراوستی کے جیت بن، مٹھ میں اور سولہ برس ساکیت پور کے، پوبھربو، (ایشیارام) مٹھ میں برمی تاریخ میں ۱۹ برس اور چھ برس کا ذکر ہے ہیونگ سانگ نے بھی چھ برس کا ہی ذکر کیا ہے۔ بدھ کے قیام کے بارے میں یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہے، اس کے مطابق صرف دو ہی مقام کے تھے جہاں بدھ نے قیام کیا تھا۔ پہلا سراوستی جہاں

۹ یا ۱۹ برس رہے اور دوسرا ساکیت، جہاں وشاکھا میں انھوں نے چھ برس تک قیام کیا۔ وشاکھا شراوستی سے جنوب میں کچھ دوری پر واقع ہے۔ اس طرح قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وشاکھا اور ساکیت ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔"

اجودھیا کے قدرتی مناظر کا ذکر کرتے ہوئے کننگھم نے یہ لکھا کہ شہر میں کچھ ٹیلوں کی موجودگی کافی معنی خیز ہے اپنی آرکیولاجیکل رپورٹ ۶۳-۱۸۶۲ء صفحہ ۳۲۲ میں وہ لکھتا ہے:

"اجودھیا کے باقیات میں سب سے قدیم جو چیزیں ملتی ہیں وہ ہیں شہر کے جنوب میں قریب پون میل کی دوری پر واقع مٹی کے تین ٹیلے۔ ان کے نام ہیں "منی پربت" "کبیر پربت" اور "سگریو پربت" ان تینوں ٹیلوں کے ساتھ ہم اس ٹیلہ پر بھی توجہ مرکوز کریں جس پر بابری مسجد واقع ہے۔ بابری مسجد شہر کے بالکل بیچوں بیچ ایک مٹی کے ٹیلے پر واقع ہے جس کی اونچائی مشرق کی طرف بیس فٹ اور مغرب کی طرف چالیس فٹ ہے اگر مغرب کی طرف دیکھا جائے تو یہ ٹیلہ ان متعدد ٹیلوں کی طرح ہے جو اجودھیا میں نظر آتا ہے۔

ان پہاڑوں کے بارے میں کننگھم کہتا ہے: برہمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ "منی پربت" ان پہاڑوں میں سے ایک ہے جنہیں بندروں نے رام کو تعاون دینے کے مقصد سے بنایا تھا، ایک حادثے کے نتیجے

میں وہ کشکندھا کے راجا سگریو کے ہاتھوں سے چھوٹ کر یہیں پر گر پڑا تھا اس ٹیلے کے جنوب کی سمت میں ۔ ۔ ۵ فٹ کی دوری پر کبیر پربت واقع ہے جس کی اونچائی صرف ۲۸ فٹ ہے اس کی سطح پرانی اینٹوں کے ڈھیر اور کوڑے کرکٹ کے سبب ناہموار دکھائی دیتی ہے اور کہیں کہیں گڈھے بھی نظر آتے ہیں ممکن ہے یہ گڈھے لوگوں کے اینٹوں کے لیے کھدائی کے سبب بن گئے ہوں اینٹوں کا سائز بڑا (۱۱ انچ ×۵ ×۲) ہے جنوب کی طرف ایک بڑا دائرہ نما ٹیلہ ہے جس کو "سگریو پربت" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زمین سے صرف آٹھ یا دس فٹ کی اونچائی پر ہے "منی پربت" اور "کبیر پربت" کے بیچ ایک لمبا اور ۴۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس احاطے میں اینٹوں کے دو مقبرے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ "شیث ؑ" اور ایوب ؑ پیغمبروں کے ہیں جنھیں پیغمبر سیٹھ اور جاب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی طرح اجودھیا کے مقامی مسلمان بھی مختلف کہاوتوں کا ذکر کرتے ہیں مثلاً شیث ؑ پیغمبر اور ایوب ؑ پیغمبر کے مقبروں کے بارے میں کہی جانے والی کہانیاں اس بات کی مظہر ہیں ان مقبروں میں پہلے کی لمبائی اس وقت اکیس فٹ اور دوسرے کی ۱۲ فٹ ہے یہ عجیب بات ہے کہ وقتاً فوقتاً ان کی لمبائی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ابوالفضل نے "آئینہ اکبری" میں لکھا ہے کہ اس شہر کے پاس دو یادگاریں ہیں۔ ایک سات...

دوسری چھ ہاتھ لمبی۔ عام طور سے لوگ انہیں پیغمبر سیٹھ اور جاب کا مقبرہ مانتے ہیں اور ان کی کرامات سے متعلق متعدد کہانیاں بھی سناتے ہیں۔"

دوسری طرف ۱۸۶۳ء میں کننگھم نے ان دونوں مقبروں کی لمبائی بالترتیب ۱۷ فٹ اور بارہ فٹ بتائی ہے اس سے ظاہر ہے کہ شیث پیغمبر ؑ کے مقبرے کی لمبائی جو ابوالفضل کے وقت ساڑھے دس فٹ تھی وہ بڑھ کر کننگھم کے وقت میں (۱۸۶۳ء) میں ۱۷ فٹ ہوگئی اور اب (۱۹۸۲ء میں) یہی ۲۱ فٹ ہے۔

کننگھم کا خیال ہے کہ یہ مقبرے حقیقت میں حضرت شیث ؑ اور حضرت ایوب ؑ کے نہ ہو ان فوجیوں کے ہیں جو ابتدا میں ترک حملہ آوروں کے ساتھ یہاں آئے اور مارے گئے۔ اسلامی روایات کے تحت مارے جانے والے فوجیوں کو سڑک کے کنارے ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ کننگھم کے مطابق مقبروں میں استعمال کی گئی اینٹیں کافی پرانی ہیں اس لیے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں گوتم بدھ نے مسواک کا درخت لگایا تھا وہ کہتا ہے

"فاہیان کے مطابق وہ مقام جہاں بدھ کا متبرک درخت پیدا ہوا تھا وہ سڑک مشرق کی طرف تھا جو شہر کے جنوبی دروازے کی طرف ہے ہیونگ سانگ نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے اس کے مطابق درخت شہر کے جنوب کی طرف اور سڑک کے بائیں طرف ہے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹیلے جواب بھی خستہ حالت میں موجود ہیں شہر کی جنوبی سڑک کے بائیں جانب ہیں اس لیے صورت حال بلاشبہ ویسی ہی ہے جیسی کہ چینی سیاحوں نے بیان کی ہے۔ چونکہ ان ٹیلوں کی حالت کی تفصیل ہیونگ سانگ کے بیان کے حوالے سے پوری طرح ملتی ہے اس لیے ان کی شناخت کے بارے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں رہ جاتا"

کنگھم کا یقین ہے کہ احاطے کے اندر چار مقبرے دو شیثؑ اور ایوبؑ پیغمبر کے اور دو حضرت ایوبؑ پیغمبر کے لڑکوں کے انھیں چار چبوتروں پر بنائے گئے ہیں جہاں پر پہلے کے چار بدھ اپنا آسن لگاتے تھے۔ کنگھم کہتا ہے

ہیونگ سانگ نے اپنے تفصیلی بیان میں بدھ کی متبرک مسواک کے درخت اور چار چبوتروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے یہ دونوں ایک عظیم استوپ کے نزدیک ہیں یہ مقام اور کہیں نہیں بلکہ اسی احاطے میں تھے جہاں ایوبؑ پیغمبر سیٹھؑ اور رجاب کے مقبرے ہیں یہ احاطہ "مٹی پربت" کے جنوبی کنارے کو چھوتا ہے یہ دونوں مقبرے پہلے کے چار بدھوں کے آسن کے ہی باقیات ہیں۔

جس عظیم استوپ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کنگھم کے مطابق وہ سمراٹ اشوک کا استوپ تھا اور یہ دو سو فٹ اونچا تھا اور یہ

اسی مقام پر بنایا گیا تھا جہاں ساکیت (اجودھیا) میں آپنے چھ برس
تک قیام کے دوران مہاتما بدھ نے مذہب کی تبلیغ کی تھی، کننگھم کے
مطابق یہی "منی پربت" ہے جو اب بھی ۶۵ فٹ اونچا ہے اور اتنا ہی
اور اونچا رہا ہوگا۔ اگر اس کے دھات کی لمبائی کو بھی شمار کیا جائے
تو استوپ کی کل لمبائی بلاشبہ دو سو فٹ تک ہوگی، ہیونگ سانگ
کے مطابق اس استوپ کو سمراٹ اشوک نے بنوایا تھا اور اس
کو غلط ماننے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کیوں کہ
آدھا مٹی اور آدھا پکا ہونے سے یہ بلاشبہ کافی قدیم ہی ہوگا۔
ممکن ہے عیسیٰ سے پانچ سو سال پہلے کا ہو، میرے یقین کی بنیاد
اس حقیقت پر قائم ہے کہ اشوک کے دور کی سبھی یادگاریں جن کا
ذکر ہیونگ سانگ نے کیا ہے اور جنہیں بھلسا کے نزدیک میں نے
اپنی کھدائی کے دوران پایا وہ یا تو پتھر کے بنے تھے یا اینٹ کے اس
لیے مٹی کے ٹیلے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ استوپ اور بھی پہلے
بنا تھا لیکن کسی بھی حالت میں یہ عیسیٰ سے پانچ سو سال پہلے کا نہیں
ہو سکتا۔

(ختم شدہ)

شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی لکھنؤ

اغراض و مقاصد

- عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کی تیاری
- مختلف اسلامی موضوعات پر سمپوزیم اور سمینار کا انعقاد
- منتخب طلبا کو تصنیف و تالیف کی تربیت
- غریب اور نادار طالب علموں کو تعلیمی وظائف
- مختلف اسلامی و سیاسی موضوعات پر انعامی مقابلوں کا اہتمام
- مصنفوں اور ادیبوں کو کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد
- یتیم اور بے سہارا طلبا و طالبات کو اعلیٰ تعلیم اور تحقیق پر خصوصی اعزاز
- ہر سال کسی منتخب شخصیت کو اس کی اسلامی اور علمی خدمات پر شاہ فیصل انعام
- اسلامی موضوعات پر لکھی گئی کتابوں پر مصنفوں اور ادیبوں کو خصوصی انعامات
- کتابوں کی اشاعت میں عوامی سرمایہ کاری اور اس پر بہتر منافع کا بندوبست
- صنعتی اداروں کی حوصلہ افزائی اور ان کے قیام میں تعاون۔
- اردو، ہندی اور انگریزی روزنامہ اور ہفت روزہ اخبارات کا اجرا
- کتب و رسائل کی اشاعت کے لیے ایک آفسیٹ پریس کی تنصیب

جاری کردہ

شاہ فیصل ریسرچ اکیڈمی ۶۹، اندرا نگری (علی گنج) لکھنؤ ۲۰